03

خان فضل الرحمٰن

میری لائبریری

ادھ کھایا امرود

کھٹ مٹھے، درد بھرے، نشاطیہ
پرانے اور نئے
(افسانے)

میری لائبریری میں 2.50

مجلد سفید کاغذ : 6.00

خان فضل الرحمان کو دیہات کی اتنی مکمل معلومات هیں کہ حجر و شجر ، چرند ، پرند ، ندی، نالے، فصلیں ، موسم ، تہوار اور رسمیں بڑی پرکاری سے بیان کرتے هیں وہ گاؤں کے لاوے ، چوکیدار ، نمبردار اور کاشتکار سے ایسے واقف هیں جیسے انہوں نے اپنی عمر انہیں میں گزاری هو۔

برکھارت ، آموں کی ریل پیل ، هریل اور هریووں کی ڈاریں ، کریل پر لگے هوئے گل هائے رخسار ایسے پھل اگر دیکھنے هوں تو اُن کی تحریر میں دیکھئے ، اسی طرح شہری اور تاریخی افسانوں میں بھی اُن کا قلم ایسے مناظر دکھاتا هے جو اس سے پہلے اُردو ادب تو کیا شاید هی کسی دوسرے ادب میں دستیاب هو سکتے هوں۔

اَدھ کھایا امرود

فیروز سنز لائبریری
(۱۰۳)

میری لائبریری میں ناول، افسانہ، ڈرامہ اور رپورتاژ کی دوسری کتابیں

زادِ راہ، منشی پریم چند، مقدمہ خواجہ محمد زکریا

میرزا ادیب کے بہترین افسانے، مرتب عرش صدیقی - رہبر صاحب، شوکت تھانوی

ندیم کے بہترین افسانے، مرتب مظفر علی سید

خوشبو کے گھاؤ، نوید انجم

فاصلے، سیدہ عفرا بخاری

زندگی کے موڑ پر، چالیس آپ بیتیاں

چاند روشن نہیں، عبدالحمید نظامی۔

۱۹۶۲ء کے منتخب افسانے، مرتب ڈاکٹر اعجاز نقوی

منزل منزل دل بھٹکے گا۔ عنایت اللہ

افق سے افق تک، آغا اشرف

حماقتیں، شفیق الرحمن

مزید حماقتیں، شفیق الرحمن

لہریں، شفیق الرحمن

پرواز، شفیق الرحمن

ہیرے کا جگر، عنایت اللہ۔

خدا دیکھ رہا ہے، عنایت اللہ۔

بہترین پنجابی ڈرامے، عبدالغفور قریشی

کرن کرن اندھیرا، آغا اشرف

میدانِ عمل، پریم چند، مقدمہ خواجہ محمد زکریا

حریفِ آدم، نصیر احمد ناصر

ڈوب ڈوب کر ابھری ناؤ (رپورتاژ) سلمیٰ عنایت

دغا باز، کمال احمد رضوی

لفنگے کی ڈائری، کمال احمد رضوی۔

فسانہ مبتلا، مولوی نذیر احمد دہلوی۔

میرے بھی صنم خانے، قرۃ العین حیدر

ننگی دھرتی، مس آئی لن چانگ

سلطانی محلوں کے راز، عبدالرزاق ملیح آبادی

روپ متی، سید فیاض حسین

پتھر کا دیس، عادل رشید

سہرے کے پھول، عادل رشید

آہٹیں، عادل رشید

بری بات، عادل رشید

دل ٹوٹتا نہیں، جعفر علی سید

قلوپطرہ، آرتھر ویگل

شیر ببر شیر، شکار کی کہانیاں

سنگ و خشت، کنہیا لال کپور

شیشہ و تیشہ، کنہیا لال کپور

چنگ و رباب، کنہیا لال کپور

۱۹۶۳ء کے منتخب افسانے، مرتبہ ڈاکٹر اعجاز نقوی

ادھ کھایا امرود

(افسانے)

خان فضل الرحمان

مکتبہ میری لائبریری لاہور

شوروم:- چوک مینار انارکلی لاہور   دفتر:- چوک اردو بازار لاہور

میری لائبریری میں پہلی بار ۱۹۶۵

ناشر :- بشیر احمد چودھری ڈائریکٹر
مکتبہ میری لائبریری لاہور

طابع :- نقوش پریس لاہور

کاتب :- محمد مسلم گیلانی چاندی کوٹ ضلع شیخوپورہ

قیمت مجلد ایڈیشن چھ روپے

ترتیب

انتساب

بنام اُردو..... اُردو جو میرے لیے زبان ہی نہیں، بلکہ رنگ رانی، امرت بانی ہے۔ ہنی سے زیادہ بنی ٹھنی، چپل ہونے کے ساتھ البلا پری۔ دھیمی مگر شوخ و شنگ، پربین، اور اٹی باز، سیلونت، لائق مند، اکھلنڈری، مُقفل مینا۔ ہندی پنجابی کی سنگو وڑی۔ سپھری سی۔ رنگ، رس بھری۔

بنام اُردو..... جگ موہنی! جسے میری نگاہِ شوق نے قدیم یونان و رُوما اور اہلِ ہنود کی دیویوں ایسا نبار کھا ہے۔ بلکہ ان دیویوں سے بھی کہیں زیادہ۔ جو اسلام مورتی پوجا کی اجازت دیتا، تو میں اس کی مورتی بنوا کر صبح شام تو شنکھ گھنٹہ بجوا کر پوجا کرتا، لیکن دیدار بازی ہر وقت ہی ہوتی رہتی۔

بنام اُردو..... چھریرے سے سڈول بدن والی چھوری جسے قدرت نے شباب دوام سے نوازا ہے۔ جس کا تیرہ برس کا سن لاکھوں برس رہے گا۔ اُردو، اُردو اُردو ہے۔ دیپ دشت اُردو۔ شہر خوباں کی محبوبہ، مہمان نواز، ملنسار، دوست دار بے تعصب، دشمن کی سمن بر۔ بھاونی۔

بنام اردو..... جو لشکر گاہوں میں پیدا ہو کر دکن اور دہلی کے شاہی شبستانوں میں ناز و نعم سے پلی جو لولی اوائل عمری میں اس کے پھُپھُم سے کلیوں ہائے ہونٹوں سے نکلے تھے۔ ان کی شیرینی اور چاشنی اب تک ادب کا سرمایہ جان ہے۔ دکن میں یہ چھل باز محبوب کو سری جن، غارت گری کو بٹ ماری، اور خنجر کو جمدھر کہتی

تھی۔ اور ادھر شمالی ہند میں یہ مُنار جسی کبھی کو گُبھو کہتی ہے۔ ایک اور بھی عجیب لفظ اس کی زبان پر ہوتا، ہُمک مِشلاً "ٹھُک میر۔ دیکھ لیا دل شاد کیا اور چل نکلے"۔ جوں جوں یہ بڑھتی گئی، اس کا لبھاؤ چو کھونٹ مشہور ہوتا گیا۔

اردو... میں نے اسکے بدن پہ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی مُغلئی پوشاک بھی دیکھی ہے اور میں نے اسے رادھا نگری ساڑی میں ملبوس، پچکتی الجاتی، اپنے چھم چھم چھم چھم کرتے ہوئے چھانجھیوں بھرے پاؤں سے قیامتیں جگاتی، کاشی ہردوار میں اشنان کرنے جاتی ہوئی بھی دیکھی ہے اس کے مُدامی بے شکن ماتھے پر کیسر کا قشقہ ہوتا تھا۔

اردو..... زبانوں کے باغ کا سب سے خوبصورت، سایہ دار، اور ثمر آور درخت ہے جس کے جُھٹ بھٹے کھوچڑ، کھر تواگر دان کر جڑ پیڑ سے اکھاڑنے پر تُلے ہوئے ہیں ان کا ارادہ تو اب سے جو رنگ کاٹ ڈالنے کا ہے۔ خدا نہ کرے جو یہ چو جیلا مائی، چھبیلی جواں مرگ مر جائے تو میں سل رہوں۔ یہ تو میرے من مندر کی دیوی ہے۔ میری اس کی سنگت کبھی ختم نہ ہوگی۔

اُردو... جسے لسانیات کے ایوان میں سرو من بند ھوا کر راج سنگھاسن پر استھاپن کرنے کے لیے لائے تھے۔ جہاں یہ خوب سجتی۔ پر اسے تو وہاں سے کھیدا جا رہا ہے۔ دشمنوں کی بار اجوری سے اس کی ہنسلی اُتر گئی۔ اس کے جیغہ ایسے رخساروں کا رنگ فق ہو گیا۔ یہ موڑھ اسے اُکھاڑ کر پھاٹک سے باہر دھکیل رہے ہیں۔ ان کا ارادہ اسے فرانسیسی ہیروئن جون آف آرک کی طرح سے زندہ جلانے کا ہے یا اس کا باؤٹا اڑا دینے کا۔ انھوں نے اسکی لوکی اس زور سے کھینچ کر اتاری کہ کان چھِگیا۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی۔

اُردو... جو ہندو مسلمان کے ساتھ چُلبلیاں کیے رقص و سرود کی محفلوں
کنکریلے۔ بنجر پیلے میدانوں دیہات اور شہروں میں پھرتی رہی ہے۔

یہ انتساب، ایک تپسّی کی طرف سے، اس لالوں کی لالی، روپ ونتی، دل
آرام کے نام۔ جسے پرانے دوست غبار کی طرح اپنے دامن سے جھٹک رہے ہیں،
اور یہ پھر بھی انہی کے دامن سے بندھی رہ کر ہر طرح کا کسالا سہنا چاہتی ہے۔ جس
کی مجھے اتنی ٹوہ لیتا ہے کہ کسی اور کو تو نہ ہوگی ——————

ڈاکٹر طہٰ حمید قریشی

تعارف

فضل الرحمن خاں اردو ادب کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ وہ زندگی کی اس منزل میں ہیں جب انسان جذبات کے جوش و خروش میں اور حیات و کائنات کے مسائل میں باہمی ربط دریافت کر لیتا ہے۔ جب زندگی کی ہر حقیقت اپنے انفرادی حسن کی وجہ سے دل کش اور قابل ذکر نہیں رہتی۔ بلکہ ادیب کے شعور کی مدد سے زندگی کی دوسری حقیقتوں کے ساتھ مل کر ایک کل بناتی ہے۔ لیکن ہر لکھنے والا اپنے ماضی سے یکسر کنارہ کش نہیں ہو سکتا۔ زندگی کے گوناگوں نقشے اور انسانی تجربات کے وسیع سلسلے اس کی گرفت میں ایک خاص شعورِ حیات کی مدد سے آتے ہیں۔ اور لکھنے والے کا مطالعہ اس کی ابتدائی دلچسپیاں اس کی کامیابیاں اور ناکامیاں سبھی اس شعور کی تعمیر میں کام کرتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جذباتی زندگی کے طوفانی دھاروں سے گزرنے کے بعد ذہن کی پختگی زندگی میں ایک ترکیب اور توازن دریافت کر لیتی ہے جو عنفوان شباب میں انسان کو میسر نہیں ہوتا۔ فضل الرحمن خاں اب ادھیڑ عمر کی منزل میں ہیں۔ اس لئے ان کے جذبات اور احساسات جوانوں کا طنطنہ رکھتے ہوئے بھی اعتدال اور توازن سے خالی نہیں ہیں۔ ان کے شعور نے جب زندگی کو دیکھنا اور پرکھنا شروع کیا اس وقت اردو افسانے میں پریم چند کی شہرت تھی اور ترقی پسند تحریک نے نئی نئی مقبولیت حاصل کرنا شروع کی تھی۔ اور اردو کے افسانوی ادب کا رشتہ ابھی رومانی دور کے لکھنے والوں سے خالی نہیں ہوا تھا۔

اردو کا افسانوی ادب اس مرحلے پہ زبان اور لب و لہجے کے اعتبار سے شاعرانہ زبان

استعاروں اور تشبیہوں کا شائق تھا۔ اور دوسری طرف زندگی کے گہرے مشاہدے میں حقیقت پسندی کا سراغ لگا رہا تھا۔ دنیائے افسانہ میں یہ تبدیلی شعوری اور غیر شعوری دونوں سطحوں پر کام کر رہی تھی۔ ہمارے افسانہ نگار اپنے اسلوبِ بیان میں جذباتی تھے۔ لیکن ان کے موضوعات جنوں اور پریوں کی بجائے انسانی زندگی کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ یہ دور پاک و ہند کی تاریخ میں اس طوفانی دور کے فوراً بعد آیا جس کی کوکھ سے تحریکِ خلافت، ترکِ موالات اور دوسری کئی تحریکوں نے جنم لیا تھا۔ جذبات کا طوفان اب اس پسپائی سے دوچار تھا۔ جس نے ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک خلاء پیدا کر دیا تھا۔ عظیم مقاصد اور بڑے بڑے آدرش دھندلا گئے تھے۔ پھر ساری دنیا اقتصادی بحران میں مبتلا ہوئی۔ چیزوں کی قیمتیں گر گئیں۔ اور اس صورت حال نے حقیقت پسندی کے رجحان کو سہارا دیا۔ اس صورت حال میں ظاہر ہے وہ عظیم مقاصد اور عظیم موضوعات نہیں پھل پھول سکتے تھے جو پہلی جنگِ عظیم سے پہلے یا اس کے فوراً بعد مقبول و محبوب تھے۔ نئے نئے علوم نے نئی بصیرتوں کے لئے راستہ تو صاف کر دیا تھا لیکن ابھی مغربی طرزِ فکر کو ہمارے معاشرے میں کوئی مستقل حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ حقیقت پسندی نوجوان طبقے میں زور پکڑ رہی تھی۔ لیکن ابھی گردوپیش کے حالات کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے کا شعور پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس دور کی حقیقت پسندی محدود موضوعات اور محدود نقطۂ نظر کی حامل ہے۔ اور اسی میں رومانی جراثیم بھی برقرار ہیں۔ اس دور کے افسانہ نگار شہری اور دیہاتی دونوں زندگیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ روایت سے ان کی بغاوت انہیں معاشرتی زندگی میں صرف چند موضوع انتخاب کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اس زمانے کے افسانے ناولوں اور شاعری

میں جنسی موضوع بڑی شدومد کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ نفسیات کے مطالعہ نے ہمارے لکھنے والوں کو یہ احساس دلادیا کہ جنسی جذبہ خیر اور برکت کی چیز ہے۔ قدیم معاشرتی اقدار میں سب سے زیادہ اسی رجحان کو دبانے اور کچلنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب علم نفسیات کی ترقی نے اسے زندگی کی بنیادی قدروں میں شامل کردیا تھا۔ ہمارے لکھنے والوں نے اسے ابتدا میں یا تو سینی ٹوریم کی فضا اور نرسوں میں دریافت کیا یا طوائفوں میں، اس لئے ہمارے افسانوں کا محبوب موضوع اس دور میں یہی طبقے رہ گئے۔ فضل الرحمن کا ابتدائی شعور بھی اسی فضا میں سانس لیتا ہے۔ ان کا پہلا ناول جو دو برس ہوئے شائع ہوا تھا جنسی جذبے کے اظہار کے لئے اینگلو انڈین معاشرتی زندگی کو موضوع بناتا ہے۔ "آفت کا ٹکڑا" میں فضل الرحمن نے جس طرز زندگی کی عکاسی کی ہے ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ وہ خود اس طرز زندگی سے کوئی براہ راست واقفیت رکھتے ہیں یا نہیں لیکن خود ناول کی حد تک وہ ایک ایسی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں جو اصلی اور حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ پھر ناول اور افسانے کی فضا سے باہر حقیقی زندگی سے ان کہانیوں اور قصوں کا رشتہ جوڑنا یوں بھی مہمل ہے۔ جب خود کہانی کے اندر ہر کردار اور ہر واقعہ اپنا مکمل جواز رکھتا ہو۔ "آفت کا ٹکڑا" دراصل تین بنیادی کرداروں کی جنسی زندگی کی روداد ہے، روز منے گارٹ روز بے اور جیری یہ تین کردار انسان کی جنسی زندگی کی تین واضح علامتیں ہیں۔ روز بے انسان کی جنسی زندگی کی غیر ذمہ دار حیثیت کو پیش کرتا ہے۔ اور روز منے گارٹ انسان کی اخلاقی قدروں کی تنظیم کا اظہار ہے۔ جیری خیر و شر کی قوتوں کے درمیان انسانی خامیوں اور خوبیوں کا مرقع ہے۔ جنس یہاں کسی معانی تعبیر و تشریح کی محتاج نہیں۔ فضل الرحمن، کے

جسمانی عمل کو اہم جانتے ہیں اور اسی کا اظہار انہوں نے اپنے ناول میں کیا ہے۔

اس ناول کا طویل ذکر زیرِ نظر افسانوں کی اصل حیثیت کو سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس سے فضل الرحمٰن کے اعتقادات کا پتہ چلتا ہے۔ اور ہم اس کی نشان دہی ہی سے موجودہ افسانوں کی روح کو سمجھ سکتے ہیں۔ لکھنے والے کی زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر جاننا نہایت ضروری ہے۔ "آنت کا ٹکڑا" اس سلسلے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ اس میں جرسی کی جنسی زندگی کو خیر و شر کی دو قوی قوتوں کے درمیان کشمکش میں مبتلا دکھایا گیا ہے۔ آخر میں آ کر جرسی کا کردار شر کی قوتوں کو کامیاب و کامگار دکھاتا ہے۔ لیکن جرسی کی جنسی زندگی جذبات کی بھٹی سے نکل کر نکھر گئی ہے اور وہ تجربات کی پیچ در پیچ وادیوں سے گزرنے کے بعد اور حیوانی جذبے کی کامیابی سے معصومیت کا ایک انوکھا روپ اختیار کرتی ہے۔ ناول کی یہ مخصوص سمت خالق فضل الرحمٰن کے تصورات کو واضح کرتی ہے۔ وہ جنس کو خیر اور برکت کی چیز سمجھتے ہیں اور جنسی جذبے کے جسمانی اظہار کو ہماری معاشرتی زندگی کی ایک اہم قدر قرار دیتے ہیں۔ وہ جنسی تعلقات اور جنسی زندگی کے دوسرے مراحل کو زندگی کی بنیادی حقیقتوں میں شمار کرتے ہیں۔

اس مجموعے کے تمام افسانے اسی بنیادی قدر سے منسلک ہیں۔ "ناگری" میں ناگری کا کردار تقسیم برصغیر کے واقعات کو پس منظر کے طور پر اختیار کرتا ہے کانگریس اور مسلم لیگ کی آویزش پاکستان کا وجود میں آنا، فسادات کا برپا ہونا۔ ان حقائق کو فضل الرحمٰن نے ناگری کے کردار کے پس منظر کے طور پر پیش کیا ہے۔ ناگری کو جنسی زندگی اور خلوص جس کے بارے میں مصنف کے عقائد پر روشنی پڑتی ہے

بہیمانہ نفرت وحقارت کی فضا میں ناگری کا کردار جنسی ضرورت کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدروں کی ایک نرالی استواری کی نشان دہی کرتا ہے۔ فضل الرحمٰن جنسی ضرورت اور بدی کو عام اخلاقی قدروں کی مدد سے نہیں جانچتے۔ اس لئے ناگری کے کردار سے اس کی اخلاقی گراوٹ کے باوجود ہمیں نفرت پیدا نہیں ہوتی۔ وہ جنسی ہیجانات کے الاؤ میں سے ایک عظیم شخصیت کے طور پر ابھرتی ہے "الائچی دانہ" بھی شہری زندگی کی فضا میں جنسی ہیجانات کو ایک نئے روپ میں پیش کرتا ہے۔ اس افسانے کی کردار عورتیں جنسی جذبے کے بارے میں بھی کوئی اخلاقی دباؤ نہیں رکھتیں۔ وہ ایک رومانی تلاش نے بانے میں جنسی جذبے کی ایک نئی تعبیر دریافت کرتی ہیں جس میں سکون اور راحت بنیادی ضرورت ہے۔ اور انسان کے ظاہری اختلافات اور رشک وحسد کے جذبے سطحی اور فرسودہ ہو کر رہ جاتے ہیں "ادھ کھایا امرود" بھی شہر کی فضا کا سہارا لیتا ہے۔ یہ افسانہ ہمارے عام افسانوں سے مختلف ہے۔ اس کی فضا میں وہی اجنبی باغوں کی مہک تو ضرور ہے جو ہمیں کرشن چندر اور اے حمید کے ہاں ملتی ہے۔ لیکن اس کے کردار کسی نیم رومانی فضا کے انسان معلوم نہیں ہوتے۔ وہ ہماری اس معاشرتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک تبلیغی واقعہ منیو کی زندگی کے رخ کو موڑ دیتا ہے۔ اور اس کی شادی افسانے کے ہیرو سے ہو جاتی ہے۔ اس افسانے میں جنسی زندگی کا ایک تیسرا روپ ہے۔ جہاں وہ کوئی شہوانی روپ نہیں دھارتا، بلکہ محض محبت کے جذبے کی تہہ میں ایک مقدس آگ کی طرح روشن رہتا ہے۔

یہ افسانے جنس کے مختلف روپ بیان کرتے ہیں۔ اور ان میں کہیں کہیں لکھنے والا ان منازل کے قریب پہنچ جاتا ہے جن پر فحش گوئی کا شبہہ بھی ہو سکتا ہے۔

لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں لکھنے والے کی نظر جنسی اعمال و افعال پر نہیں جنسی ہیجانات کی تعبیر پر زیادہ ہے۔ یہاں افعال چٹخارہ لینے کے لئے بیان نہیں کئے گئے۔ وہ صرف اصل جذبے کی شکل و صورت متعین کرنے کے لئے بیان ہوئے ہیں۔ اور ان کا رشتہ کہانی کے تار و پود سے اس طرح مربوط ہے کہ قاری کہیں بھی کہانی کی فضا سے الگ ہو کر لطف اندوز ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔ جنسی جذبے کا خارجی اظہار اس وقت خطرناک ہوتا ہے جب اسے مقصد کے طور پر اور مجرد شکل پر پیش کیا جائے۔ فضل الرحمٰن جنسی افعال کی کڑیاں معاشرتی زندگی کے ساتھ اس طرح پیوست کرتے ہیں کہ ان واقعات و اعمال کی اپنی کوئی خارجی حیثیت نہیں رہتی۔ وہ جنس کو زندگی کے عام معاشرتی مسائل کی طرح دیتے ہیں۔ ان کے ہاں جنس محض ایک حیوانی جذبہ نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی میں افراد اور معاشرتی اقدار کے ساتھ ساتھ اس کی نوعیت بدلتی چلی جاتی ہے۔ وہ سکہ بند اخلاق کے علمبرداروں کی طرح ہمیشہ خیر کی کامیابی اور شر کی ناکامی نہیں دکھاتے۔ کیونکہ انہیں عام زندگی میں ایسے واقعات سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ جہاں بدی کامیاب ہوتی ہے اور نیکی ناکام رہتی ہے، چنانچہ "الائچی دانہ" میں جنس بدی سے وابستہ ہے۔ اور "کھایا امرود" میں جنسی جذبہ نیکی کا تار و پود بن گیا ہے۔ "ناگری" میں جنسی محرکات کی کوکھ سے اخلاقی قدریں جنم لیتی نظر آتی ہیں۔ جنس کے یہ تین روپ شہری زندگی کی فضا میں پروان چڑھتے ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ دیہاتی زندگی کو پیش کرتا ہے۔ "ننگ پیری" "باجے والا" "ترلوکی" "دھومن" دیہاتی زندگی میں جنس کے چار مختلف روپ ہیں۔ دیہاتی اور شہری افسانوں میں ایک بین فرق زندگی کے مسائل کے علاوہ یہ نظر آتا ہے کہ یہاں جنسی جذبہ

معاشرتی زندگی کے تکلفات و تصنعات سے بڑی حد تک خالی ہے ۔ یہ دیہات تقسیم سے پہلے کے وہ دیہات ہیں جن میں غیر متمدن قبائل اپنی محدود زندگی میں دلچسپی رکھتے ہیں ۔ ان کی ضروریات بھی محدود ہیں ۔ ان کے مسائل بھی سادہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور زندگی کے سادہ روپ میں جنسی ضروریات اور جنسی تقاضے کبھی تو "دمومن" کا روپ دھار کر واضح ہو جاتے ہیں اور کبھی جنس "باجے والا" کے مرکزی کردار کی طرح دبے دبے گھٹے گھٹے پیار کا روپ دھارتی ہے ۔ ان افسانوں میں جنسی جذبے کی مختلف صورتیں کار فرما ہیں ۔ ننگ پیری "ترلوکی" باجے والا اور دمومن یہ کردار عام دیہاتی زندگی سے مستعار ہیں ۔ ان کی تمام زندگی کی ضرورتیں اور مسائل بھی ہمارے عام دیہات کے مسائل ہیں لیکن ان افسانوں کی ظاہر فضا ایک ہوتے ہوئے بھی کرداروں کی داخلی زندگیاں مختلف ہیں ۔ ان افسانوں کے بعض کرداروں کے جنسی افعال درندگی اور بہیمیت کے رجحانات ضرور رکھتے ہیں ۔ اور یہ شاید لکھنے والے کی اپنی جنسی زندگی کے غیر مطمئن ہونے کا اشارہ ہے ۔ لیکن فنی پختگی کی وجہ سے فضل الرحمن اپنی اس خامی کو چھپا جاتے ہیں اور ہر جگہ ایسے کرداروں کو بنیادی بہیمیت نہیں دیتے ۔ اصولاً ... وہ بد اعمالی اور انسانی سیرت کی نیکی کو متضاد نہیں سمجھتے ۔ اس لئے ان کے بڑے کردار بھی معاشرتی زندگی میں کوئی نہ کوئی ضرورت پوری کرتے ہیں ۔ بدی کے روپ میں چھپی ہوئی نیکیوں کی تلاش و جستجو فضل الرحمن کے افسانوں کی خاص خوبی ہے ۔ وہ انسانوں کو انسانوں کے روپ میں دیکھتے ہیں ، فرشتوں کے روپ میں نہیں دیکھتے عام زندگی کے چلتے پھرتے کردار ان کا موضوع ہیں انسان کے ذہنوں میں چھپے ہوئے جذبات و احساسات فضل الرحمن کی گرفت میں آکر زندگی کی قدروں میں

ایک نیا توازن اور ایک نئی ترتیب دریافت کرتے ہیں۔ وہ ذہنی زندگی کی ترجمانی میں آس پاس کے ماحول کو بھی فراموش نہیں کرتے۔ انہیں شہری اور دیہاتی زندگی دونوں پر گرفت حاصل ہے۔ شہری زندگی میں انسان کی ذہنی حالت جن خارجی معاشرتی اور جنسی پابندیوں سے دست و گریباں ہوتی ہے۔ فضل الرحمٰن کو اس کا پورا احساس ہے۔ اور دیہاتی زندگی میں انسان کی خواہشات اور آرزوئیں جسطرح اظہار کے کھلے مواقع ڈھونڈتی ہیں، ان کا بھی انہیں پورا پورا احساس ہے۔ دیہاتی زندگی میں وہ عام طور پر وحشی اور نیم وحشی قبائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ دیہاتی فضا کو پریم چند کیطرح محض نیکی کی فضا نہیں سمجھتے جس میں ہر کردار اخلاقی اور سماجی قدروں کی مثالی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ ان کے کردار صرف جنسی زندگی کی حد تک مثالی ہیں۔ عام معاشرتی زندگی میں یہ لوگ انسان ہیں فرشتے نہیں۔ ان سے بدیاں بھی سرزد ہوتی ہیں اور نیکیاں بھی۔ ان کی زندگی میں نیک کام بھی ہیں اور جرائم بھی۔ البتہ ان کے اظہار کی نوعیت معاشرتی فضا کیوجہ سے بدل جاتی ہے۔ فضل الرحمٰن کا فن معاشرتی زندگی کی جھلکیاں دکھانے میں بھی بنارہ نہیں ہے۔ وہ سماجی شعور بھی رکھتے ہیں، اور زندگی کے واقعات کو ایک دوسرے کے پس منظر میں رکھکر اس سے نتائج بھی اخذ کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی دیہاتی فضا محدود ہوتے ہوئے بھی ہند و پاکستان کی عام معاشرتی فضا سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ وہ افسانہ نگار ہیں، معاشرتی زندگی کے مصلح نہیں ہیں۔ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں اس میں خلوص گہرائی اور حالات کا تجزیہ سبھی کچھ موجود ہوتا ہے۔ لیکن بے ضرورت تبلیغ اور نعرے بازی سے کوسوں دور ہیں۔ تمدنی زندگی کے بارے میں وہ گہری نظر رکھتے ہیں۔ لیکن کہانی کے بہاؤ

کو رد ک کر پریم چند کیطرح وہ واعظ پر نہیں اتر آتے۔ اس لحاظ سے انکا طریق کار احمد ندیم قاسمی سے زیادہ ملتا ہے اور تمدنی زندگی کے بارے میں غیر ضروری تفصیلات اور خطابت ان کے ہاں نہیں پائی جاتی۔

فضل الرحمٰن کے افسانوں کی زبان کے بارے میں بھی شاید یہ عرض کرنا بے موقع نہ ہوگا کہ وہ عام بول چال کی دیہاتی زبان سے لے کر ادبی زبان تک استعمال کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کو شاید یہ زبان کھردری اور ناہموار معلوم ہو۔ لیکن زبان کے استعمال میں وہ اپنے افسانوں کی فضا اور ان کے کرداروں کو ضرور مدنظر . . . . رکھتے ہیں۔ ان کے دیہاتی اور ہندو معاشرت سے متعلق کردار جو زبان بولتے ہیں وہ عام قاری کے لئے اجنبی ہو سکتی ہے لیکن ان کرداروں کی فطری زبان ہے۔ ادبی اور علمی زبان انہوں نے زیادہ تر شہری افسانوں میں استعمال کی ہے۔ تاہم یہ لسانی تجربہ ہے۔ اور تجربے میں ظاہر ہے کہیں کہیں کھردراپن اور ناہمواری آ ہی جاتی ہے۔ آئندہ چل کر مشق اور تجربے سے زبان بھی نکھر آئے گی۔ انہوں نے فی الحال ہماری افسانوی زبان میں نئے ذخیرۂ الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ اور اسے نیک فال تصور کرنا چاہیئے۔

ناگری

۱

ڈوبی مچھلی ایسی ململ سی ہندو لڑکی ناگری نے جب سے سنا تھا کہ اس کے عجمی کو کانگرسی گرگے اور بنیڈی کھوپڑی کے جھمبو خاں نے میرابائی کے چوک میں گالیاں دی ہیں وہ غصے میں اونٹ رہی تھی۔ عجمی نے جھمبو خاں سے یہ کہا تھا کہ وہ جناح کو گالیاں نہ دے اور نیک بخت کھٹ بٹ نے رحمت اللہ نے عجمی کی تائید میں سورہ الحجرات کی آیت پڑھ کر سنائی تھی۔

اس پر جھمبو اور اس کے شتونگڑے گالی گلوچ سے بڑھ کر عجمی پر تو دست درازی نہ کر سکے مگر کھٹ بٹ نے رحمت اللہ کو بری طرح زد و کوب کیا گیا۔ اگر ایک شریف النفس تھانیدار جھمبو کو پکڑ کر نہ لے جاتا تو شاید عجمی کی بھی مرمت ہو جاتی۔ تھانے میں بڑی بڑی ہستیوں کے فون آنے شروع ہو گئے تھے کہ جھمبو کو چھوڑ دیا جائے۔۔ ورنہ قومی کام کو دھچکا پہنچے گا۔ تھانے سے چھٹتے ہی جھمبو نے عجمی کی حویلی کے سامنے کھڑے ہو کر جو سراگیوں کے مندر کے مقابل رانی بازار میں تھی' باآواز بلند' غراٹے کے ساتھ' مغلظات سنائی تھیں۔ اور یہ سڑیل فقرہ بار بار دہرایا تھا: "ابے' اب باہر نکل کر دیکھ! مار مار کر ڈنبا بنا دوں گا۔"

ان واقعات کی مذمت کرنے والے خود کانگریسی ہندو تک تھے۔ مگر جب سے ناگری نے اپنے چھوٹے بھائی کرپا کی زبانی سنا تھا کہ اس کے بچی کو بگھو نے گالیاں دی ہیں وہ غصہ میں بُری طرح اونٹ رہی تھی۔ اس نے اس سخت گرما اور لو کی دوپہری میں آرام نہ کیا۔ وہ یہ تہیہ کر چکی تھی کہ بجبو خاں سے ضرور کرارا بدلہ لینا ہے اور جب تک اس میں کامیابی نہ ہوگی وہ کھانا نہ کھائے گی۔ چنانچہ اس نے دوپہر اور رات کا کھانا نہ کھایا تھا۔ اسے اپنی بچی کی بڑی فکر پڑی ہوئی تھی۔ اسے اتنا غصہ عمر میں کبھی نہ آیا تھا۔ آج جب اس کا باپ سردواری، چھوٹا بھائی کرپا اور بڑا بھائی ملکندا چھت پر سو گئے تو وہ آدھی رات کو اپنے بستر سے اٹھی۔ وہ ننگے پاؤں تھی کہ چاپ کی آواز سنائی نہ دے۔ مگر جب وہ زینے کی آخری سیڑھی سے انگنائی میں اترنے لگی تو امرود کے نیچے رکھے ہوئے گلار نے دردناک اور زور زور کی آوازیں نکالنی شروع کر دیں۔ گلار کے پنجرے کو بلی نے الٹ رکھا تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اور اگر ناگری اتفاقاً نہ پہنچ جاتی تو طوطے کا کام تمام ہو گیا ہوتا۔ چھت پر جا کر ہو گئی تھی۔ ناگری نے پنجرے کو اوپر لا کر کرپا کے پاس رکھ دیا۔ آج وہ غصے اور فکر کے سبب گلار تک کو اوپر لانا بھول گئی تھی۔

جب سب سو گئے تو وہ دوبارہ اٹھ کر انگنائی میں اتری اور سب سے دریچہ بغلی کوٹھری میں جا کر دیا جلایا۔ پھر اس نے اپنا غرارہ نما زنانہ پاجامہ اور نین سکھ کی کرتی اتار کر مسہری کے تکیے پر ڈال دی۔ اس وقت اس کی خوش قامتی اور سجیلا پن البیلا تھا جیسے قدیم یونانی مجسموں کی آن بان۔ اگر کوئی کاشتکار اسے دیکھتا تو وہ اسے ایسی لگتی جیسے منڈی میں گندم کے بڑے بڑے صاف صاف اول نمبر دانوں

کی ہتھیلی پر رکھ کر بانگی دکھائی جا رہی ہو۔ اس نے ٹرنک سے کرپا کا اونچا جوگنا قمیض نکال کر پہن لیا اور اس کی دھوتی بھی باندھ لی۔ جب اس نے چھوٹی باڑ کی کشتی نما ٹوپی اوڑھ کر آئینہ دیکھا تو اس کی ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ اس کے پاؤں میں ربڑ سول کے عنابی جوتے تھے۔

وہ اپنے گھر سے نکل کر گلیوں اور سڑکوں میں کو ہوتی ہوئی شمال مشرق کیطرف سارنگیوں کے مندر پہنچی، جس کے سامنے مچھی کی حویلی اور دوکانیں تھیں۔ اپنے بانکپن میں اور اضافہ کرنے کو اس نے دھوتی کا نچلا پلا ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ یہاں سے وہ صرافہ، پنسار ہٹہ، پھول والوں کے کوچے اور جامع مسجد بازار سے گذرتی ہوئی گندی گلی میں پہنچی۔ جھمبو یہیں رہتا تھا۔ وہ اس جگہ پہلے کبھی نہ آئی تھی مگر یہ پتہ تھا کہ اگر تانگوں کے اڈے کی طرف سے گلی میں جائیں تو دو چھوڑ کر تیسرا مکان کوٹھے کے آگے اسارے والا جھمبو کا تھا۔

وہ اڈے کیطرف سے گلی میں داخل ہو جاتی مگر جب ہی ایک کالے سے دو بجے سنگھ ٹھیکیدار جنگلات کا لڑکا، برج بھوکن، اپنی داشتہ قبولی، جھمبو کی ہمشیرہ کو اتار رہا تھا۔ قبولی گھر میں داخل ہو چکی تو ناگری نے دروازہ کے باہر والی کنڈی آہستہ سے لگا کر دیوار پر رکھی ہوئی پرانی پرچھتی کو دیا سلائی دکھا دی۔ صبح سے لُو کا زور تھا، اب بھی چل رہی تھی، اس لئے آگ آن کی آن میں پرچھتی سے اولیتوں تک پہنچی اور چھپر جلنے لگا۔

جب وہ چھپٹی ہوئی گلی سے نکل رہی تھی تو شمال کیطرف سے ایک آدمی آتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے اسی طرف جانا تھا مگر وہ جنوب کیطرف ریلوے اسٹیشن

والی سڑک پر پلٹ پڑی - آنے والا اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا - جب وہ تقریباً
نصف فرلانگ کے فاصلے پر پہنچ گئے - تو گندی گلی سے شور بلند ہوگیا - ناگری
کے پیچھے آنے والے آدمی نے بھمبو کا چھپر جلتا ہوا دیکھ لیا تھا - اور چونکہ اس محلے
میں سو فیصدی مسلمان رہتے تھے اس لئے راہ گیر کو یقین ہوگیا تھا کہ آگ اسی
ہندو لڑکے نے لگائی ہے جو گلی سے نکل پہلے تو اس کی طرف آیا تھا اور پھر پلٹ
کر تیزی کے ساتھ ایسا جھپٹا جا رہا تھا کہ یہ آدمی اس کے پاس تک نہیں پہنچ سکتا تھا - اب
یہ شخص ناگری کو پکڑنے کے لئے اس کیطرف دوڑا - ناگری بھی بھاگنے لگی - مگر راہ
گیر نے کچھ فاصلے پر جا کر اسے آگے سے روک لیا اور چاندنی کی چھاہٹ میں
اسے صاف نظر آگیا کہ وہ لڑکا نہیں لڑکی ہے - اس پر مستزاد یہ کہ اس کی باہوں
میں پتلی پتلی، نئی نئی سنگریاں بھی تھیں - راہ گیر نے اسکا پہنچا اب بھی نہ چھوڑا
تو ناگری تنگ کر بولی: "ارے کھٹ سبنے! میں تو ناگری ہوں اور میں نے
اس بھسنڈے کے گھر میں آگ لگائی ہے جس نے مجھے گالیاں دی تھیں
اور مارا پیٹا تھا - تو کہاں جا رہا ہے -؟"

"میں تو لاہور جا رہا ہوں مجھے میرے بہنوئی نے بلایا ہے - جس کی وہاں
بان کی اور چارپائیوں کی دکان ہے - پر تو نے بھمبو کے گھر میں آگ کیوں لگائی
اور یہ مردانہ کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟"

"اس نے مجھے مارا جو تھا اور گالیاں جو دی تھیں!"

"تو میں نے تجھے اس کا گھر جلانے کے لئے نہیں کہا تھا - اس نے مجھی
صاحب کی بھی تو بے عزتی کی تھی - بس میں سمجھ گیا تو نے اس کا گھر کیوں پھونکا

ہے۔ جس طرح تو میرے کبوتر باز بھتیجے ہمداد سے ملتی ہے۔ اسی طرح عجمی صاحب سے ملتی ہوگی مجھے پتہ ہے کہ تجھے ہمداد نے کبوتر دیئے تھے۔ آخر میں تیرا پڑوسی اور محلہ دار ہوں۔ میری گاڑی آنے والی ہوگی مجھے اسٹیشن پہنچنا ہے۔ تو اپنے گھر جا! مجھے کیا پڑی کہ میں تیرا راز کسی کو بتاؤں۔ پر تو نے یہ اچھا نہیں کیا۔ کیا خبر بھبو اور اس کی بہن جل کر ہی مر گئے ہوں۔ آتنی رات گئے جب گھر والے پڑے سو رہے ہوں، آگ نہیں لگایا کرتے۔"

۲

اس واقعہ سے اگلی شب ناگری عجمی کو اس کے چوبارے والے باغ میں ملی۔ عجمی کوٹھے پر سگرٹ پی رہا تھا۔ ناگری بولی: "عجمی جی، سگرٹ نہیں پیا کرتے!"

"کیوں ناگری؟"

"اس لیئے کہ اس سے آگ لگ جانے کا ڈر ہے۔"

پھر ناگری نے بتایا کہ بھبو کا گھر رات کو اس نے پھونکا تھا۔ اسے اتنا غصہ آرہا تھا کہ وہ اسے پونوں میں نہیں بلکہ دن دوپہر میں پھونکتی۔ اور یہ عجمی دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ گیا کہ آدھی رات گئے اجلاف اور شہدوں کے اس محلے میں یہ ٹوٹی ایسی انکیلی ہندو کنیا کیسے گئی ہوگی۔ ناگری نے عجمی کو رحمت اللہ کھٹ بنے کا واقعہ بھی سنا دیا تھا۔ اب عجمی کو یہ یقین ہوگیا کہ ناگری کی محبت کوئی کھیل نہیں، اصلیت ہے۔

اس کے ایک ہفتے بعد وہ چوبارے کی اسی سمت میں بستر پہ بیٹھے تھے۔ اونچی اونچی کھڑنیوں میں چھپے ہوئے پپیہے نے بول بول کر جنگل کے پنچھی پکھیرو جگا رکھے تھے۔ میٹھی میٹھی رات تھی اور نیلا نیلا آسمان اور اجالا پاکھ۔ کھڑنیوں کے اوپر بلا پتوار کی ناؤ ایسا بادل کا ٹکڑا روئی کے پہل کی طرح اڑ رہا تھا۔ چھوٹی بڑی ڈونگریوں کی طرف سے ٹٹیریوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تب ناگری نے الف لیلے کی کہانی سنائی تھی کہ ہارون الرشید نے کسی کو دسترخوان پہ بلایا، جس نے مچھلی نہ کھائی۔ کارن پوچھا تو کہا کہ وہ جو اس کی ایسی تھی، جیسی کہ میں تمہاری، اسے مچھلی کی باس نہ بھاتی تھی۔ مجھے سگرٹ کی باس نہیں بھاتی۔ یہ سن کر عجمی نے منہ کی سگرٹ چھت سے نیچے پھینک دی تھی اور اس کے بعد اس نے کبھی تمباکو نہیں پیا تھا۔

بھمبو کے گھر میں کیا ہوتا! مگر اس نے غوغا کیا کہ وہ ہزاروں کے نیچے آ گیا۔ کانگرس کو اس کی ضرورت تھی کیونکہ ابھی پاکستان نہیں بنا تھا اور انتخابات نزدیک تھے۔ اسے کپڑا اور سامان مل گیا۔ اس کا مکان از سر نو تعمیر ہوا۔ چھت پر عمدہ کی کڑیاں پڑیں اور چھپر کی جگہ ٹین نے لے لی جس کے نیچے سمبل کے تختے لگائے گئے کہ تپش نہ آئے۔ جب تک مکان تیار نہ ہوا وہ کانگرس بھون کے کوارٹروں میں رہا۔ بھمبو علی الاعلان کہتا پھرتا کہ اس کے گھر کو عجمی نے پھنکوایا ہے۔ صبح اسے گالیاں ملی تھیں، شام کو آگ لگ گئی۔ مگر اس کا کوئی یقین نہ کرتا تھا۔ ہر کوئی سمجھتا تھا کہ اس نے اپنا گھر خود جلایا تاکہ اسے مال ملے اور وہ شہرت پائے۔ مگر یہاں بھمبو سچا تھا۔

(۳)

یہ واقعات پاکستان بننے سے پہلے پیش آچکے تھے۔ جب پاکستان بن گیا تو بھیو ترمع قبو کی فوراً پاکستان سدھارا، اور ٹجمی نے بھارت میں ہی ٹھہرے رہنے کی ٹھان لی۔

پھر بسنت بہار کے دنوں کا ذکر ہے کہ سفری امرود پر پلے کے مارے ہوئے کھٹی پتوں میں گول گول اور سفید پھل اترتے سورج میں چمک رہے تھے۔ ان پر پارے کی تیز رنگ چتکاریاں عجب لطف دے رہی تھیں۔ اگر ان امرودوں پر چاندی سونے کے ورق بھی لگا دیئے جاتے تو یہ سماں پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ جو انگور کی بیل سہ دری کے سامنے دیوار پر چڑھی ہوئی تھی وہ پت جھڑ سے ایسی ہو رہی تھی جیسے ارتقائی اطلس پر دریائے آمیزن اور اس کے معاون۔ نرنو کھیری لگیلا نیٹو کے اوجڑ محل پر، جس میں جی رہتے تھے، نیل کنٹھ کا جوڑا بولتا، اڑتا اور کھیلتا پھر رہا تھا اور کبوتروں کی ٹکڑی گھر کا تا دا کرتی اڑ رہی تھی۔ پڑوس کے دھیما مندر میں بسلسلۂ گدی نشینیٔ مہنت جے جے رگھبیر سرن خوشی کے سنکھ بج رہے تھے۔

ٹجمی گھر کا دروازہ کھول کر اندر آیا اور ناگری کے پاس جا کر کہنے لگا: "مجھے چھپاؤ! مجھے چھپاؤ!" ناگری دلان میں پلنگڑی پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھی بسنتی دوپٹے میں لچکا لگا رہی تھی۔ کل اسے بسنت پنچمی کے میلے میں جانا تھا۔

ایک اجنبی کے اچانک اندر آنے پر امرود پر منگے ہوئے چند رہنی کے طوطے نے چلا چلا کر گھر سر پر اٹھا لیا۔ سبز پتوں میں لگے ہوئے بڑے بڑے، چکنے چکنے سفید امرود، جن پر پارے کی گلابی چتکاریاں پڑی ہوئی تھیں، اترتی دھوپ میں بھلے معلوم ہو رہے تھے۔

"مجھے چھپاؤ! مجھے چھپاؤ!" کی آواز سن کر پلنگ پر بیٹھی ہوئی ڈھلی مچلی

جیسی ناگری بولی : "اگر کسی کو چھپائے نہ بنے ؟"

"دل کی کنجی ! یہ ٹھٹھول کا وقت نہیں ۔"

"کیوں کیا ہوا ؟"

"پہلے کہیں چھپ کر بیٹھیں ۔ میں آج یہاں خوشی خاطر نہیں آیا ۔"

ناگری کی بھابی، جس نے نامحرم مرد آنے پر گھونگھٹ نکال لیا تھا، اندر ہی اندر مسکرانے لگی ۔

ناگری اسے لے دریچہ بغلی کوٹھری میں لے گئی جہاں صرف ایک پٹاپٹی نواڑ کا پلنگ بچھا ہوا تھا ۔ دوسرے کی وہاں گنجائش ہی نہ تھی ۔ ناگری نے سے سرہانے بٹھایا ۔ چارپائی تو کھری تھی مگر اس نے مہمان کے دونوں مونڈھے پکڑ کر کمر پیٹے ہوئے بستر سے لگا دی ۔ وہ جوتے نکال کر لیٹ گیا ۔ ناگری پائینتی سے اوپر ہو کر اس کے نزدیک ہو گئی ۔

سرخ چونچیوں والے بڑے بڑے سفید امرودوں کے پیڑ میں لٹکا ہوا طوطا اب بھی شور مچا رہا تھا ۔

"تم اسے کسی طرح بند نہیں کر سکتیں ؟" اس نے ناگری سے التجا کی ۔

"بند تو وہ پہلے ہی ہے ۔" اس نے آنکھ کی جھپکی دے کر مذاقیہ انداز میں جواب دیا ۔

"تو اچھا، اڑا آؤ ۔ مگر جلد ۔"

وہ دوڑی ہوئی باہر نکلی اور ایک بڑا سا سفید اور چتیلا امرود توڑ کر پنجرے میں ڈال دیا ۔ کچھ امرود توڑ کر کشتی میں رکھے اور اندر سے آئی ۔ مگر امرود

پر ایسے پلا جیسے کوئی حکومت کا بہت بڑا نقادہو اور اسے کوئی بڑا عہدہ دے کر غیر ملک کو بھیج دیا جائے ۔

پھر وہ اندر آکر پوچھنے لگی: "اب بتاؤ ۔ کیا معاملہ ہے؟ بیورے دار سناؤ۔"

"ایسے نہیں بتاؤں گا ۔ تو مجھ سے بہت دور بیٹھی ہے ۔ سنا ہے تو آہستہ آہستہ پاس آکر سن لے؟ اور دیدے سے لگا کر سن ۔"

وہ اتنی آہستگی سے اس کی طرف آنی شروع ہوئی کہ نو وارد نے اس کی بگڑیوں بھری بانہہ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا: "ارے ری بجے کی دم باز! کیوں زیادہ ترسا رہی ہے ۔؟"

"ہم تمہیں ترسا دت نہیں ۔ آہستہ آہستہ پاس آ رہے ہیں ۔ یوہی حکم سرکار تھا ۔"

"کیسی اُتر اُتر اور الٹی پلٹی باتیں بگھارنے لگی:"

"موہن دیوالی میں ایسا ہی ہونا چاہیے ۔ بسنت پڑ رہا ہے ۔ پھاگ نہیں کھیل سکتے ۔ دور بیٹھی ہے ۔ آہستہ آہستہ پاس آکے سن ۔ آہستہ آہستہ پاس آ رہی ہوں ۔ حکم بجا لانا ہے ۔"

"میں تجھے کچھ آہستہ آہستہ سنانا چاہتا ہوں ۔"

وہ اپنی سیاہ گرگابی اتار کر بستر پر اس کے برابر کمر لگا کر بیٹھ گئی ۔ اب وہ گویا ہوا: "پہلے ذرا منہ میٹھا کر لوں ۔ آ، ذرا پاس کو آ ۔"

"آلی میرے گھر میں آیا ہے ۔ شیرنی باٹوں؟"

بجمی نے ناگری کا سر پیٹے ہوئے بستر پہ رکھ کر اس کا چہرہ آنکھیں گاڑ کر دیکھا

اور بے حد تندی اور بلانوشی سے اس کے ہونٹ چوسے اور اتنے چوسے کہ ناگری کے ہونٹوں سے پان کا کھوٹا نجمی کے ہونٹوں پر آ رہا۔

"لاؤ ہتنک تمہارا بدن دبا دوں۔ تھکے ہوئے سے لگتے ہو۔"

"تھکا ہوا تو نہیں، گھبرایا ہوا ہوں۔ پیر دبا دے۔ میں تھکا ہوا تو ہوں۔"

"میں نہیں دباتی!"

"دبا بھی دے، زہرن، قہرن۔"

"نہیں زہری، قہری! نہیں، نہیں! اتیاچاری، نہیں!"

"تجھے ٹکا سا جواب دینا نہ آتا تھا۔"

"سیکھنا پڑا۔"

"کیوں؟"

"جھوٹ کے توڑ کے لئے کبھی کہتے ہو تھکا ہوا نہیں۔ کبھی کہتے ہو ہوں۔"

ناگری گرمیاں کرتے ہوئے اس کی ٹانگیں دبانے لگی۔ نجمی نے کہا: اب ذرا عقل سے بیٹھوں گا۔ ناگری، کہیں کسی نے مجھے دیکھ نہ لیا ہو۔"

"دیکھ لینے دو۔ اور تمہیں یہاں کون جانتا ہے! بندا قانون گو، رفعت سوڈے والا اور نور دچڑی مار، دو دو دفعان ہو چکے، پاکستان جا چکے۔ ان کے گھروں میں کوباٹیے شرنارتھی آئے ہیں۔ انہیں دروازوں پر کھڑے رہنے کی عادت نہیں۔ اب اور بتاؤ۔"

"میں گھر جا رہا تھا۔ راستے میں کانگرسی، ور احراری کال اور محمود مل گئے۔

کہنے لگے: عجمی صاحب، آپ کے گھر مہمان آئے بیٹھے ہیں۔ ذرا جلد پہنچیے۔ میں گھر کی طرف لپکا۔ جال والی مسجد کے نیم تک پہنچا تھا کہ اس تمہارے چھٹن بھائی کرپانے ہاکی لئے ہوئے اسکول کی طرف جاتے ہوئے آواز دی: "بھائی جی گھر نہ جانا۔ دوڑ آئی ہوئی ہے۔ آپ کی تلاشی لے رہے ہیں۔ مسلح پولیس کا ٹرک سڑک پر کھڑا ہوا ہے۔ آپ کو گرفتار کریں گے۔" مجھے یہ نہ سوجھتا تھا کہ تمہارے بھائی نے مجھے تمہارے گھر آنے سے منع کیا ہے یا اپنے گھر جانے سے۔ اس کشمکش و پیچ میں جا رہا تھا....."

"عجمی جی، آپ کو ضرور گرفتار کر لینا چاہیے۔ آپ بھارت کے بیری ہیں اور پاکستان کے رہبر۔"

"اور ناگری جی آپ؟"

"جی، میں.... میں.... میں۔"

"جی، ناگری جی، آپ.... آپ.... آپ نے بندے قانون گو کی بیوی کا برقع دھوکے فریب سے منگوا کر ایک غیر حاضر عورت کا ووٹ مسلم لیگ کے بکس میں ڈالا۔ اگر میں یہ ہاتھ جب ہی پکڑ لیتا جس میں آپ نے بھی بے ٹھیرے کی انگشتری پہن رکھی تھی؟"

"عجمی جی، یہ تو آپ سے ایک کھلی تھی۔"

"جی، یہ آپ کی ادا تھی۔"

"اور جب کٹا کٹی ہو رہی تھی، تو ان مسلمانوں کو کون بچاتا پھر رہا تھا جنہوں نے کانگرس کو ووٹ دیئے تھے۔ اور اب کون مسلمان کو پاکستان جانے سے

روکتا پھرتا ہے ؟"

"کیوں ، اس میں کیا قباحت ہے ؟"

"جتنے منہ کم ہوں گے اتنی ہی خوراک بچے گی ۔"

"اچھا تو میں چلا جاؤں ؟"

"شریمان جی آپ کو کون روکتا ہے ۔ میں تو اول دن سے کہہ رہی ہوں ۔"

"کیا ؟"

"خیر ، یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ جہاں کا پتھر ہے وہیں لگنا چاہیے کیونکہ گستاخی میں شمار ہوگا ۔ مگر یہ چتاؤنی دیتی ہوں کہ اولے پڑنے سے پہلے سر کی چنتا لازمی ہے ۔"

"کہتی بھی سب کچھ ہو اور گستاخی بھی نہیں کرنا چاہتی ۔"

"خیر شریمتی جی ، آپ کی یہاں چاہنا نہیں ۔ آپ کے باغ بغیچوں میں تو جھولے سری گوبند سنگھ کے سکھوں نے اسوج سے جھولے ڈالے تھے ۔ آج بسنت آگئی ۔ ابھی تک جھوٹنے لیے کر ان کا من بھرا نہیں اور آپ کا وہ پہاڑ کی ٹلیٹی والا دو کوسا فارم آپ کے ہالی کیرے آپس میں بانٹ چکے ۔ آپ کے پاس یہاں دھرا کیا ہے جس کے ساتھ چپک رہے ہو ؟"

"میرے پاس سب کچھ ہے ۔ بتاؤں ؟"

"بتاؤ ؟"

"میرے پاس ایک نول چھبیلی ہے ۔ آپ نرم نرم الیسی کھاری اور کھڑی زبان الیسی کراری کراری !"

"اگر وہ آپ تمہارے ساتھ وہاں جانے کو تیار ہو۔ کہہ دو، اس کیلئے وہاں چارہ نہیں!"

"ہاں چارہ نہیں

"وہاں اس کے لئے چارہ نہیں، جس نے اسے اپنی ماتر بھومی سے بھی دور رکھا، اس کے لئے چندے دیئے دل وجان سے ووٹ دیا، پرارتھنا کی۔"

"کیا ہو گی!"

"تو جس کے چیلا سرے میں آکر یہ کام کئے اسے چاہیے مجھے سنگ لے جانے کے لئے نیوتا دے۔"

"ایسا کبھی نہیں ہو گا"

"ساتھ نہیں جاتی ...... ٹھور ٹھیاکر کے نیوت لینا!"

"نہیں!"

"اور بھجی جی، آپ جو کہا کرتے ہیں کہ میری صورت ایسی خراب ہے کہ اسے ہر ایک بری ہی نظر ڈالتا ہے تو کیا آپ اس کارن بھی مجھے پاکستان لے جانا نہیں چاہتے؟"

"اب تو تجھے سچ مچ الہام ہو گیا۔"

"شکریہ، بھجی جی، شکریہ! نمسکار کرتی ہوں، نمسکار۔ گنگا کے میلے میں چکی رہی ہے کا کیا کام! تمہاری رواداری تمہیں مبارک۔ نہ لے جایئے، بھجی جی! میں کون سی وہاں جا کر سبرن کی ہنسلی، رتناولی، ہیروں کے جڑاؤ چمپا کلیاں اور ہزاری دھکدھکی پہن لیتی۔ دھنیہ ہے تمہارے اچل اور اٹل ارادے پر۔

نجمی جی، دھنیہ! کون کسی کے سنگ جاتا ہے۔ اور مجھے کون تمہارے سنگ جانے دیتا۔ میں تو بس تمہارا دل دیکھ رہی تھی۔ میرا جی ہی رکھنے کے لئے کہہ دیا ہوتا "چلی"۔" انتربید چھوڑ کر کون کہیں جائے گا۔ تم دل کے بڑے کچے اور بودے نکلے۔ تم نے اتنی بے طاقتی دکھائی۔ میں تمہیں اتنا ادھیرج نہ سمجھتی تھی۔ تمہارے اس چھوٹے سے دیس میں ایک ڈوبی چھلی کی کھپت کیسے ہو سکتی تھی۔ جسے اپنا ہی آپا سنبھالنا بھاری ہو وہ دوسرے کا بوجھ کیسے سہارے گا۔ اچھا تو خود ہی چلے جایئے۔ ایسا بھی کبھی نہ ہوگا۔"

"نہیں! جب میں اوروں کو وہاں جا کر بار بننے سے روکتا ہوں تو خود وہاں کیسے جا کر پڑ رہوں۔ ہم بھارت کے مسلمانوں نے پاکستان اسلئے نہیں بنایا کہ خود وہاں جا کر بے مہمان ہو جائیں۔ دسترخوان بچھایا گیا۔ مہمانوں کی خاطر؛ کھانا کم ہے: اور میزبان آپ لمبے لمبے ہاتھ مارنے لگا اور مہمان ابھی لقمہ بھی نہ لینے پائے تھے۔ کہ ہاتھ دھلانے کی سلفچیاں آنے لگیں۔ ہماری یہ منشا ہرگز نہ تھی۔ کشتی میں جتنے مسافر بیٹھ سکتے تھے، بیٹھ گئے۔ اگر اوروں نے بھی لدنے کی کوشش کی تو کشتی کو خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ مجھے اپنی جان سے زیادہ کشتی پیاری ہے اور اگر بوجھ کی وجہ سے اسے کچھ بھی گزند پہنچنے لگے تو میں وہ پہلا شخص ہونگا جو بیچ سمندر میں کود پڑنے سے ذرا بھی نہ ہچکچائے گا ....

ناگرہی کیا سو گئیں؟"

"سوئی نہیں، آنکھیں بند کئے لیٹی تھی کہ نیتا جی کا ناکھیاں غور سے سن سکوں۔ انسانوں سے کشتی بھلی! اور پاکستان کے ویروں سے اس کے شتر وبھلے۔ مجھ

اور بڑھو نتا بھلو خاں، جو قائداعظم کے لئے نئی نئی گالیاں تراشا کرتا تھا۔ وہ جھبڑ دس تو اپنی بہن تبولی کی بھڑوائی کھاتا کھاتا وہاں پہنچ کر مزے اور سکھ پائے اور عجمی، جو "زندہ باد۔ زندہ باد" پکار پکار کے اپنا گلا بٹھالیا کرتا تھا بھارت کی جیلوں میں پڑا سڑے۔ اچھا، عجمی جی، نہ مانو بلٹھہر و مکڑے سے جاؤ اور قید کاٹو۔ آپ اسی قابل ہیں۔ آپ کے دوست بابو امر سنگھ نے آپ کو بہتیرا قائل کرنا چاہا کہ بھلے آدمی، جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب تو کانگرس میں شرکت کرے۔ مگر۔"

" ناگری، تجھے معلوم ہے کہ ہم مسلمانوں میں کسی کا مالک وارث مر جایا کرتا ہے تو ایک مدت معینہ تک سوگ منایا کرتے ہیں۔"

" اور تم نے یہاں کی مسلم لیگ کیوں نہیں توڑی اور جھنڈا دفتر سے کیوں نہیں اتارا؟"

"میں نے تو لیگ کونسل کے اجلاس میں صرف یہ کہا تھا کہ آپ لیگ کو توڑنا چاہیں تو توڑ دیں مگر اس کاغذ پر میرے دستخط نہیں ہوں گے اور نہ میں پھریرے ہی کو نیچے کھینچوں گا۔ دراصل میرے خلاف شہر کانگرس کا مسلمان صدر اور ضلع کا ایم ایل اے زہر افشانی کرتے رہتے ہیں۔"

" ایم ایل اے! وہ تو تمہاری ماسی کا لڑکا ہے۔ پر تم نے بھی اس کے خلاف کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اور وہ برج بھوکن ایشور اسے غارت کردے، کہتا پھرتا ہے کہ عجمی کو کتنے کیطرح گولی مارے گا۔"

عجمی ناگری کے پاس عصر کے وقت آیا تھا اور جب جھٹپٹے کے وقت دھیما مندر میں سنکھ اور گھنٹے بجے تو گرپا آکر بھاوج سے پوچھ رہا تھا کہ ناگری کہاں

ہے اور وہ گنگوں کی کڑاہی پر ذرا کو ہاتھ ٹھہراتے ہوئے ایک چارپائی والی کوٹھڑی کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ "وہاں!" اس کے بعد بھی کا ذکر آگیا اور بھابی نے اسے منہ سے بتایا کہ وہ بھی ناگری کے پاس ہے:

"وہیں۔"

(۴)

پولیس کو سان گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ مجرم فراری، جو مسلم لیگ کا سیکرٹری اور اعیانِ شہر میں سے ہے۔ ہر دواری کھٹیک جیسے پنچ کے گھر میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور ناگری کو کون نہیں جانتا تھا۔ تقسیم کے بعد اسے لاہوری شہر نار بھیوں کے بگڑے ہوئے لونڈوں نے پچیس روپے پر نیپالی ہوٹل میں بلایا اور پچاس روپے کی انگریزی شراب پلا کر اس کی وہ خاطر تواضع کی کہ آدھی رات ہوتے ہی اس کی سٹی گم ہو گئی۔ ان گنوں کی پولیس کو خوب خبر تھی۔

تو پولیس کو سان گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ مسلم لیگ کا سیکرٹری اور نیشنل گارڈ کا سربراہ ہر دواری کھٹیک کے گھر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ کسی کو علم نہ تھا کہ یہ سوہے دفاؤں کی بے وفا، ترکیبوں بھری قتالہ عالم لڑکی ۔۔ جو مردانہ لباس میں رام چندر جی کا بھیس بدل کر اجب ہاتھی پر سوار، شہر کے بازاروں میں گھومی تھی تو شہر کے ہندو مسلمان ایسے پری زاد ملوک کو دیکھنے کے لئے ڈھوک آئے تھے ۔۔۔۔ اگر بادنا تھی تو صرف بھی سے۔ اس گنہگار او رچوکھاڑ کی کی رگ اگر کسی سے دبتی تھی تو وہ بھی ہی تھا۔

عجمی اس کے پاس ہفتہ بھر ٹھہرا رہا۔ اسے روز روز گھی کے گلگلے، میٹھی پوریاں، کدو کش کی ہوئی لوکی، کوتھمبیر، پودینے اور ٹماٹر کا رائتا، پیٹھے کا مربہ، چھلکا اترے ہوئے باداموں پڑی ماش کی دھلی دال، مونگ کا حلوہ، سونٹھ کا پانی، دودھ پڑے چھوارے، سفید زیرہ اور بالائی ملی دہی، شملے کی مرچیں، ادرک، آلو اور ٹماٹر کا سالن، مگدر اور سفید سفید تلوں کے لڈو اور تل شکری کھلایا جاتا رہا۔ نہانے کے لئے پیتل کے چمکدار تہتہڑے گرم پانی سے بھرے ہوئے موجود رہتے۔ کوٹھری میں اگربتیاں اور لوبان جلتا رہتا۔

اور ناگری! وہ سچے گوکھرو لگا چمپئی گھگرا، کپاسی ریشمی انگیا اور لچکے والی بسنتی اوڑھنی پہنے اس کے زانو سے زانو لگائے بیٹھی رہتی۔ کبھی عجمی کے ہاتھ میں اس کے مہندی رچے ہاتھ ہوتے تو کبھی عجمی کے ہونٹوں پر اس کے پان رچے ہونٹ۔ اس مختصر سے گوشۂ تنہائی پر بہشت کی وسعتیں نثار تھیں۔ سچ ہے: من چنگا تو کٹھوت ہی میں گنگا!

ناگری کے گھر میں بجلی کا چاندنا نہیں تھا۔ اس کے باپ کو یہ خبر تھی کہ عجمی ان کے گھر روپوش ہے اور ان کی لڑکی اس کا من بہلاوہ تھی۔ مگر رات کو اس کے مقررہ وقت پر دوکان سے واپسی کے کچھ قبل ناگری کوٹھری سے باہر آکر رسوئی میں کام کاج کرنے لگتی۔ عجمی کے پاس کھانا کرپا پہنچاتا تھا لیکن پیتل کے چمکتے ہوئے تھال میں بھوجن ناگری ہی پروستی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ اور بھائی کے ساتھ کوٹھے میں لیٹتی مگر جونہی اس کا باپ خراٹے لینے لگتا وہ آنکھ بچا کر دیوانہ گیر بچھا کے ایک بستر والی کوٹھری میں پہنچ جاتی۔ سامنے والی کوٹھری میں

ناگری کا بڑا بھائی مکندا اور اس کی بیوی سویا کرتے تھے کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ ناگری حسینوں کی جبلی اور عام عادت کے تقاضے پر مہمان کو ترسانے کے لئے اس کے پاس نہ گئی۔ دراصل ناگری کا یہ چلبلا پن، انکار اور جھنجھٹ مہمان کا منہ سلونا کرنے کے لئے تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس کے بے طلب عطیات اور دوامی شیریں طبعی سے اکتا جائے۔ چٹ چوروں کے لئے سدا کی شکر فروشی اچھی نہیں۔ انہیں موقع بہ موقع نون ہار، بنجریا کٹھن کھرے چنے بھی بننا پڑ جاتا ہے۔ وہ اسی طرح جلتی آگ بجھانے کے لئے تیل ڈالا کرتے ہیں۔ ناگری کے اس ہیکڑے پن میں بھی بڑے ہی مزے تھے، بڑے ہی! مربہ کھانے کے بعد اگر اچار مل جائے تو کیا کہنے!

عجمی ایک بڑے زراعتی فارم کا مالک تھا۔ جہاں مختلف اجناس پیدا ہوتے تھے۔ وہیں اسے مکئی کی روٹی اور چنے کے ساگ کا شوق پیدا ہوا تھا۔ ناگری اسے یہ بھی مہیا کرتی اور ساتھ ہی زرد زرد گاوے گھی سے تر تر ائی ہوئی لال مکئی کی میٹھی چوری بھی، جس میں کستوری، پستے اور کشمش ملی ہوتی۔ اس کے لئے بھینس کے بالائی دار دودھ کا دہی کورے کلہڑ میں جمایا جاتا، جس سے سوندھی سوندھی۔۔۔ خوشبو آتی۔ یہ دہی وہ گھی چڑھی ہوئی روٹی کے ساتھ کھاتا۔ پاس ہی تپائی پر رنگین اچاریاں رکھی ہوتیں، جن سے وہ سانگرہ، لیموں، آم، گاجر، مولی، ٹماٹر کا اچار، گگروندے، سیدب، آملے کا مربہ اور امرود کی جیلی لے سکتا۔

جب یوں ہی خمر و عیش میں ہفتہ بیت گیا تو ناگری کی بھاوج نے دُسے خبر دی اس کے ساجن کی گرفتاری پر ایک ہزار کا انعام مقرر ہوا ہے اور

بہت لوگ اس کی کھوج اور ٹنگن میں سرگرداں پھر رہے ہیں۔ یہ سن کر وہ سہم سی گئی اور وہیں کھڑے کھڑے اس نے سنا کہ میاں مٹھو فرما رہے ہیں :۔

"مجھے چھپاؤ، مجھے چھپاؤ!" اس نے پنجرہ امرود سے اتار کر زمین پر پٹخ مارا۔ پھر وہ کوٹھے پر چلی گئی۔

گلی کی دوسری جانب امام بخش پہلوان رہتا تھا۔ اس کے سیاہ فام لڑکے امداد کو کبوتر بازی کی علت تھی۔ ادھر ناگری کے پاس بھی بہت کبوتر تھے۔ پہلے پہل تو ان میں پیشہ ورانہ رقابت چلی۔ مگر امداد نے ناگری کو ہر موقع ہرا کر چھوڑا۔ یہی نہیں کہ اس کے کبوتر اڑان میں مات کھاتے رہے بلکہ وہ اس کے بہت سے بہکے ہوئے پرندوں کو پکڑنے میں کامیاب رہا۔ انہیں وہ خوب پر قینچ کر کے نہایت خواری میں رکھتا۔ اس سے اس کا مقصد ناگری کو تاؤ دلانا اور جلانا تھا۔ اس داؤ پیچ کا یہ اثر ہوا کہ ناگری دانے پر لگ گئی۔ سال میں مفاہمت ہو گئی۔ امداد نے اسے شاہجہان پور کے لکھے، سندیلے کے یاہو اور فرخ آباد کے چلپرے نذر کیے۔ فرخ آباد کے چلپرے دیکھ کر ناگری وارفتہ ہو گئی تھی۔ مگر پہلوان کے لڑکے کے یہ نذرانے بے سبب نہ تھے۔ وہ ان کا بدل کابلی قرض خواہ کی طرح وصول کر لیتا تھا۔

پر جب ہفتہ سارا گذر گیا اور اسے ایک مرتبہ بھی ناگری نہ ملی تو امداد بوکھلا سا گیا۔ اسے ٹوہ سی لگ گئی کہ وہ کہاں الوپ ہو گئی ہے۔ سو اب جو وہ بسنت پری بنی، سر تا پا لہلہی کپاسی پوشاک میں غرق، پیلی پیلی چوڑیاں پہنے، ہرا ہرا

گیندے کے گجرے گلے میں ڈالے، کانوں میں بجلی کے بالے پہنے مہندی سے ہاتھ پاؤں اور ناخن رچائے، گلوری کھائے، کوٹھے پر جا کر نیلے آسمان تلے کھڑی ہوئی تو امداد صبر و قلب کھو بیٹھا۔

پھر امداد نے سیابیے کبوتروں کا جوڑا اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا:

"لے بے! آج کا بنا ؤ چناؤ خالی نہیں جانا چاہیئے۔"

"کیوں"؟

"جلوے! آ، یہاں آ۔ تنک گھڑی بھر کو برساتی میں چل کر بیٹھیں۔"

"کیوں، کوئی ٹپاٹپ بارش تو نہیں ہو رہی؟"

"نہیں، ٹپاٹپ بارش تو نہیں ہو رہی مگر سینے میں چھٹ پٹ ضرور ہو رہی ہے۔"

"ارے امداد سوفتہ نہیں؟"

"تو تو پھر شاخیں نکالنے لگی۔ آنکھ ٹیڑھی کئے کھڑی ہے۔ پڑوسیوں سے دل بدل اچھی ہوتی ہے۔ ناٹکر نہیں کیا کرتے۔ میں تو سمجھا تھا تو اب سیدھی ہو چکی ہے۔"

"ارے بباوی، میں کبڑی کب تھی؟"

"تیرے ٹھسے تو آج ایسے تھے کہ جگن ناتھ کی رتھ میں بٹھا کر تیرا جلوس نکالتے۔"

"جا رے، جا! خوشامد خورے۔ میں تیرے بڑھاوے میں نہ آؤں۔"

"خوشامد خورا تو میں نہیں۔ پر، بھاوتی، ایک بات ضرور ہے: تو سراپا

ناز ہے، میں ناز برداروں میں ہوں۔ تجھے امانی پر کام کرنے والے بہت ملے ہوں گے۔ میں تو تیرا بارہ ماسیا ہوں۔"

"آگے نہ بڑھ! میری گات کو چھیڑا تو جھنجھنیاں پہنا دوں گی۔ بندھا بندھا پھرے گا۔ کانٹیں، تجھ سے تو مجھے کپڑا چھڑانا بھاری ہو گیا۔ ذرا اس تاڑ دکو دیکھو، مجھے کیسی آنکھیں چیر چیر کر دیکھ رہا ہے۔"

"ستیاناس جانی، تیرا نور سا ترجائے۔ مجھے نراس نہ کر۔ آنا کانی چھوڑ۔ رہی نہ الانگ، تاجدار چڑیا! کئی دن سے بڑی بے چینی ہو رہی ہے۔ کام میں جی نہیں لگتا۔ نٹھلا بیٹھا ہوں۔"

"ارے الّو کی چونچ! ڈیوٹ! اوٹ پٹانگ باتیں کر کے میری بوٹیاں نہ کھا۔ زیادہ لگ رہی ہے تو اپنی لڑکوری پر جا، گل دو پہر یے!"

"میری گلابی ریوڑی! میری جادو کی پڑیا تو تو ہے۔ اس پر کیسے جاؤں۔ تیرے ہی لئے تو میں تونسا تونسا رہتا ہوں۔ جھانولی بالا تو تو ان بے زبانوں کو دانہ پانی دینا بھی بھول گئی۔"

"اور تو جو تھا۔"

"اگر میں خبر گیری نہ کرتا تو سب تتر بتر ہو گئے ہوتے۔ میں تو انہیں ٹکٹی تک کھلاتا رہا، پر تو نے ان کی اڑان ایک دن بھی آ کر نہ دیکھی۔ کیا کسی مہمان کی خاطر داریاں ہو رہی ہیں؟ خدا اس کا بستر گول کرے۔"

"ارے کبوتر باز، یہ بات نہیں۔"

"تو پھر تیرا پے کیوں نہیں ملتا؟"

"بس سبتیا نہیں ہوتا۔

"اچھا، مجھے پلک پیٹ کر دکھا۔ پہلے مجھے تیرے اسی سبھاؤ نے مارا تھا۔"
اس نے دو دفعہ پلک پیٹی اور ایک دفعہ سین ماری اور یوں اپنی لہلہی دکھا کر زینے کیطرف چل دی اور امداد طوفانِ شوق میں گھرا ہوا اسے دیکھتا رہ گیا۔

نیچے طوطا اب بھی بول رہا تھا: "مجھے چھپاؤ، مجھے چھپاؤ۔" اور اس کے اوندھے پنجرے کو نگر کٹنی چھمو تجن سیدھا کر رہی تھی۔ ناگری کی لٹک جھٹک دیکھ کر تجن کے منہ سے نکلا: "تو کب سے دلہن بن گئی؟ ہمیں تو پتہ بھی نہیں ہوا۔"

ناگری نے اپنی چھتر آنکھوں سے تجن کیطرف دیکھا۔ اس سے پنجرہ چھپٹ کر کھڑکی کھولی اور طوطا اڑا دیا۔ چھمو تجن ابھی اس کی طرف تک ہی رہی تھی کہ اس نے لپک کر جا کوٹھری میں دم لیا، تجن بھابی سے کہتی رہ گئی: "بڑی ہوائی اور نخرے پیٹی لڑکی ہے۔ وہاں اس کا کون بیٹھا ہے جو یوں تیر کیطرح جا پہنچی۔"

چھمو کٹنی کے چلے جانے کے بعد ناگری نے بھگرے والے پیر سلیمانی کا دیا ہوا گنڈا کوٹھری کے دروازے پر ٹانگ دیا اور تجی کو لئے ہوئے کوٹھے پر چڑھی۔ وہاں اس نے سات پاموز مہمان کے سر پر سے وار کر اتر پچھم کیطرف پھینکے کہ جس طرح یہ واپس آئیں گے اسی طرح سے مسافر بھی آجائے گا۔

نیچے آکر تجی تو کوٹھری میں چلا گیا اور ناگری صدقے کے پاموزوں کی متوقع واپسی کے لئے چھتری تکنے لگی۔ اسے یوں گھنٹے بھر سے زیادہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ جھٹپٹے کے وقت دھیما مندر میں سنکھ اور گھنٹے بجنے لگے لیکن ان میں سے

ایک بھی کبوتر چھتری پر نہ اترا۔ پھر وہ کوٹھے پر گئی کہ وہ وہاں ضرور اتر گئے ہوں گے۔ لیکن وہاں اور سب تھے، وہی سات نہ تھے۔

یوں ژولیدہ حال وہ اندھیرے میں نیچے اتری اور کوٹھری میں سے نجمی نے دیکھا کہ وہ کوے ٹھنڈے کرتی پھر رہی ہے۔ روہانسے پن سے اس کا حاشیہ دھن کچھ بگڑا ہوا سا تھا اور رنگ فتنہ گری کجلایا ہوا سا۔ شام سے کتے بھونکنے لگے اور لگے دن گلیا اینٹ کے اجڑ محل سے گیدڑ ایسا غائب ہوا جیسے دن میں تارے۔

۵

اس نے طوطا اڑا دیا۔ اسے اس کی گردن مروڑ دینی چاہیے تھی۔ وہ طوطا گلیا اینٹ کے اجڑ محل، اٹاریوں، چھ باروں، دو منزلوں، چھ منزلوں، چھتوں، منڈیروں، گنبدوں، میناروں، دوکانوں، اصطبلوں، کیکروں، بیریوں، اور پرانے آموں پر بیٹھتا، رازِ افشا قسم کی آواز "مجھے چھپاؤ، مجھے چھپاؤ" بلند کرتا پھرتا تھا۔ خلق کے سروں پر سے جھانجھ دار پینجنیاں بجاتا اور مجھے "چھپاؤ، مجھے چھپاؤ" چلاتا گزرتا۔ ناگری نے جو سات پاموز نجمی پہ سے وار کر پھینکے تھے، انہیں تو اجڑ محل کے اطیبوں سے لٹوروں اور تہ مچھیوں نے ایک ایک کر کے دبوچا اور کھایا۔ لیکن اس طوطے پر دھاڑ نہ پڑی۔ اس کے چرچے چنڈو خانوں، تاڑی گھروں اور دیسی شراب کی بھٹیوں تک میں ہونے لگے۔ چار کھونٹ اسی کی آواز آرہی تھی۔ اس کا چرچا ہر جگہ تھا۔ مگر اس کی

نہ کسی نے بھی نہ پائی تھی۔

ایک دن وہ طوطا گلال باڑے سے اڑ کر پولیس چوکی کے متصل، نیپالی ہوٹل کی بکائین پر آ بیٹھا۔ رنگروٹ تھانیدار جوشی کے پاس بھسو جھج آئی ہوئی تھی۔ اسے تھانیدار سے کتنا پالینا تھا، مگر تھانیدار کی جیب خالی تھی۔ اب جو طوطا "مجھے چھپاؤ، مجھے چھپاؤ" بول کر کان پھوڑنے لگا تو پہاڑی جوشی نے جھجن کو ٹالنے کے لئے کہا:۔ "جس گھر کا یہ طوطا ہے، اُجمی وہیں روپوش ہو گا.........."

جھجن ہزار روپے کی لالچ میں کوتل گھوڑے کی طرح بھاگی اور شہر کے دوسرے سرے پر جا، سرداری کھٹیک کے گھر سانس لیا۔ اس وقت سکر دوپہری تھی۔ بھابی چولہا چھوڑ کر کوٹھری میں سو رہی تھی، بھسو جھجن نے اپنی سوکھی ہوئی کلائی اندر ڈال کر گھر کا کنڈا کھول لیا۔

وہ بلی کی طرح دبے پاؤں چل کر ایک بستر والی کوٹھری میں جھانکنے لگی مگر عجمی نے اس کی آہٹ پالی۔ جب وہ انہیں دیکھ کر پلٹی تو عجمی نے اسے دروازے پر جا پکڑا۔ سامنے والی کوٹھری میں لے جا کر اس کا منہ اور کان لوگر ٹھونس کر اس طرح باندھ دیئے جیسے کسی جراح نے اس کی مرہم پٹی کی ہو۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھی جوڑ دیئے گئے مگر ناگری کی رحم دلانہ سفارش پر اتنی رعائیت برتی گئی کہ وہ ذرا ہل جل سکے۔ باہر سے کنڈی لگا دی گئی۔ اور اسے بھابی کی چارپائی پر بٹھا دیا گیا۔

کٹنی کو قابو کر کے ناگری اور عجمی اپنی اوبچ پر پھولے نہ سمائے اور کوٹھری

میں واپس آ گئے ۔ انہیں اس واقعے سے ایسی خوشی ہو رہی تھی جیسے سرحد کے قبائلیوں نے دشمن کا دیکھ بھال کرنے والا طیارہ مار گرایا ہو ۔

راز چھپانے کا کوئی دوسرا جتن ہو ہی نہیں سکتا تھا ۔ اور کٹنی کو وہ کب تک جیس بے جاپیں رکھ سکتے تھے ۔ اس رات ناگری نے سنجیدگی کے ساتھ کہا: " میں نے تمہاری بات مان لی ۔ بس تم پاکستان نہ جاؤ ۔"

" اس لئے کہ تو نے جو سات کبوتر مجھ پر تین تین بار وار کر اڑائے تھے ان میں سے ایک بھی نہیں لوٹا ، انہیں شکرے ترچھی کھا گئے ہوں گے ۔"

" سب کو ؟ "

" ہاں ، سب کو ۔"

" نہیں ، سوامی ، ایسا کب ہوتا ہے ۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ شکرے ترچھی ایسا بال بندھا نشانہ ماریں کہ سات میں ایک بھی پکشی بچ کر نہ آئے ۔ اور اسی دن سے اوس پڑوس میں گرٹنک بھی تو نہیں اڑے ، وہ بھی کہیں گپت ہو گئے ۔ تیل میں چھپل بھیلا ، ناگر موتا ، بالچھڑ کی ملونی کر کے جو صدقے کے چراغ میں نے کل کرپا کے ہاتھ جیدا ہے پر رکھوائے تھے ۔ وہ جھلملا جھلملا کر بجھ گئے اور ہوا سوئی ہوئی تھی بلکہ دُھم سا ہو رہا تھا ۔ انہیں بجھانے کے ۔۔۔ لئے پچھم دشا سے پتہ نہیں کیونکہ ایک جھونکا آ گیا ۔ پرسوں میں نے پجاری کے پاس گھی بھیجا تھا کہ وہ بھڑکتی ہوئی اگیاری پر ڈال ڈال کر پاٹھ کرے کہ میرا پیارا ہونا کال یاترا سے جلدی لوٹے ۔ پجاری نے اگیاری پر گھی ڈالا تو ایسا لگا کہ جیسے پانی کے چھینٹے دیئے جا رہے ہوں ، اس سے آگ تنگ

بھی تو نہ بھڑکی۔ آج جب تم صبح صبح سو رہے تھے تو میں دھیما مندر میں کلپ استھاپن کرنے گئی۔ ابھی جلد بھر پانی بھی نہیں چھڑکا تھا کہ کلسا آپ سے آپ میرے ہاتھوں میں ٹوٹ گیا۔ میرا کلیجہ دھڑکے ہے بھجی جی! تم مت جاؤ۔"

"تو تیری سیدھی الٹ گئی۔ سفلی عملوں میں ایسا ہی ہو جاتا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ لاکھ و شواش دیتی ہوں مگر بھینر والا نہیں مانتا۔ امرود کے کھارے میں تلسی اور مروے کے گملے رکھے ہیں۔ انکی کلیاں مرجھائی ہوئی ہیں۔"

"تجھے تو وہم ہوگیا۔ میں تو ابابیل اڑنے سے پہلے لوٹ آؤں گا۔ تو مجھے برسات کے بھادے سے پہلے یہاں دیکھے گی۔"

"اور جو برسات ہی نہ آئی؟"

"برسات نہ آئی؟ ایسا کب ہوتا ہے۔ ایسا کبھی ہوا ہے؟"

"بھجی کے اس فقرے پر ناگری کے ہونٹوں کی چھوٹی چھوٹی پنکھڑیاں کھلیں اور بند ہوگئیں۔ پھر وہ سخن پروانہ انداز میں بولی: "برسات تو آئے گی، پر پچھیتے کا کیا ہوگا؟"

"پہلے روڑے ڈنڈے سے کرتی پھرنا۔" پھر بھجی نے کئی بار اس کا منہ چوم کر پوچھا:۔

"برسات تو آئی، پر دور دیس جانے والا نہ آیا تو پھر کیا کرے گی؟"

"اپنے منہ سے نہ کہو۔"

"فرض کیا ابابیل اڑ ہی اور تیرا سوامی نہ آیا تو تو کیا کرے گی؟"

"گاؤں گی۔"

"کیا۔"

"منجھیلی رات کاری۔ پیا بن لاگے بوند کٹاری۔ پیا بن لاگے رین بھاری

منجھیلی رات کاری۔"

مورکھ کیوں گھبرائے ہے۔ جی نہ چھوڑ اور خرخشے میں مت پڑ۔ میرا وہاں جانا ایسا ہے جیسے برھمن جگانوں میں جا رہا ہو، جیسے کوئی اپنی چیز محفوظیت کے لئے بنک میں رکھ دے۔ اس لئے جی بھاری نہ کر۔ وہ مسلمانوں کے لئے بسم اللہ کا گنبد ہے۔"

"ہم ہندو ہیں۔ ہمیں سود بھی چاہیئے۔ کیا تم وہاں سے زیادہ لال لال اور بلوان ہو کر بہوڑو گے۔"

"تجھے ایسی ہی امید رکھنی چاہیئے۔"

"تو تم ابابیل اڑنے سے پہلے ہی لوٹ آؤ گے۔ جو کالے میگھ والی برکھا رت میں اڑتی ہے۔ جب دیوالی کے دیئے چاٹ کر بل میں گھسا ہوا کوئی بھی سانپ اپنے بل میں نہیں رہتا۔ تم اتنی مدت وہاں کیا کرو گے؟ آج کل جئی اور برسیم کے کھیت کو نہا دیں نیگ لگی ہوئی ہیں۔ جئی تو کئی جگہ اپنے ہی زور کے کارن کھیت میں گر تک گئی ہے۔ تم برسیم پر پھول آنے سے اور جئی کی بانت بھری جانے سے پہلے ہی لوٹ آنا۔"

برسیم پر پھول مئی میں آتا ہے اور جئی اپریل میں کٹتی ہے۔ تو میں آخیر

مارچ تک آجاؤں ؟"

ایسے پوچھ رہے ہو جیسے میری اچھا کا پالن کرنے کو دیرانتی پڑنے سے پہلے ہی جیت بہار میں لوٹ آؤ گے ہجب ہوئے چل رہے ہوں گے ۔ ایشور کرے ایسا ہی ہو ۔ نہیں ، نہیں ! سوامی میں اور تم کبھی بن میں جا چھپتے ۔"

" یہ کہاں ہے " ؟

اس جگہ سے ساٹھ میل ۔ وہاں پہاڑ نظر نہیں آتے ۔ ان پر پٹے ہوئے دیودار ہی دیودار دکھائی دیتے ہیں ۔ بس کہیں کہیں کوئی برف کی چوٹی ضرور دھوپ میں چمک جاتی ہے ۔ گڑیال کا مزا وہاں ہے ؛ وہاں ہم گھیپ گھوڑوں کی طرح سنسان بن میں کھڑ بڑ کھڑ بڑ کرتے پھرتے ، گھیپ گھوڑوں کی طرح نہیں بلکہ جنگلی گھوڑوں کیطرح کودتے پھاندتے پھرتے ۔ لیکن میں اب تمہارا دن مں کا مہمان ہوں ، ناگری ۔ مگر ....."

" مگر کیا ، سوامی " ؟

" وہ مجھے پکڑ لیں گے ۔ میرے بچ نکلنے سے کیا فائدہ ؟ "

" تو ، سوامی ، مجھے بھی اپنا سبھاگا پاکستاں دکھلا ۔"

" تو وہاں کیسے جاسکتی ہے ۔ ؟ وہ مسلمانوں کا ملک ہے ۔"

" تو میں بھی مسلمان ہوں ، نجی جی ، جیسے آپ اچھے ویسے ہی آپ کا مذہب دھرم بھی اچھا ۔ مجھے اپنے جوتے میں سکھ تلے کی جگہ رکھ کرلے جاؤ ۔ جو تم مجھے بول بھی نہ لے گئے تو میں سرسوتی کیطرح تمہارے قدموں تلے بہتی ہوئی چلی آؤں گی : مان لے شیام موری کہی سے ۔ جو بھارت نے پاکستان کو کہیں

دیا تو میں انہیں منہ کیطرح رل کر چلی آؤں گی۔ بولو، تم مجھے کیسے روکو گے؟
میں تو راکشسی ہوں۔ جو اپنے ساتھ کو نجوں کیطرح ایک پانت میں نہیں لے جا
سکتے تو بستی چڑھے ہوئے پنجرے میں ڈال کر لے جانا۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا
برمی لاجونت اور بھوزکیلی چڑیا ہے۔ رونق اور راجپائے سے گھبراتی اور بدکتی
ہے اس لئے یوں لئے جا رہا ہوں۔"

"یکشنی جی' میں نے تو ری کہی مان لی۔"

"تو دن دکھلوا لوں؟"

"دکھلوا لے!"

"پھر بھی بانٹوں گی"

"بانٹ دے"

٦

ناگری اس وقت وفورِ انبساط سے ایسی بن گئی تھی جیسے دوپہر میں سورج
مکھی کا پھول۔ خوشی کے مارے اس سے بولا تک نہیں جا رہا تھا۔ اس کا رواں
رواں کھل اٹھا تھا۔

وہ گجی کو لانگ پھلانگ بستر سے کود کر باہر آگئی۔ اس کا باپ دکان
بڑھا کر آنے والا تھا۔ رسوئی گھر میں جا کر اس سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ اترا کر
دبیدے مسکاتے ہوئے بلا سوچے سمجھے اپنی بھابی سے کہنے لگی "بھابی،
بھابی، بھابی جی!"

"کچھ تو نے پڑا پایا ہے جو اتنی خوشیوں میں آ رہی ہے۔"

"بھابی، بھابی، سنو تو۔ دیکھو میں تمہیں کیا سنانے آئی ہوں۔ میں کتنی نچھتری ہوں۔ میرا کپال کھل گیا۔ بھور بانٹوں گی۔ آسا پنڈت کہاں ملے گا؟"

"کیا کرنا ہے؟"

"دان دکھلواؤں گی۔"

"کس کارن؟"

"ہم بھی پاکستان جا رہے ہیں۔"

"کون کون؟"

"بس میں اور وہ، پکشی جی بھی آخر پاکستان چل ہی دیئے۔"

"یہ پکشی جی کون ہیں؟"

"بھابی، انہوں نے قائداعظم کا پکش لیا۔ پاکستان بنوایا۔ وہ قائداعظم کے پکشی ہیں اور میں ان کی پکشی ہوں۔ وہ آدر کے کارن مجھے پکشی جی کہتے ہیں۔"

"بلّی، دل الٹی، یا روں جوگی، اتنا کسی پہ نہیں مرمٹا کرتے۔"

"بھابی میں تو ان کے سنگ جاؤں گی، پر جانگی بھابی، وہ تو میرے گرو ہیں، میں ان کی بالکی، میں نے پاکستان کا ووٹ ڈالا تھا۔"

"جب سے انہوں نے یہاں ڈیرے ڈالے تو تو کھلو باؤلی سی بن گئی۔ تیرے منہ پر پھٹکار سی برس رہی ہے، تیرے ہونٹوں اور گالوں پر

کھرونچیں آ رہی ہیں۔"

"ملی بھابی، میرے منہ پر تو اسی دن سے پھٹکار برسنے لگی جب میں نے تمہارے بھائی کے ساتھ سانٹے کی سگائی سے انکار کیا تھا۔"

اس نوک جھونک اور کھٹا پٹی سے ناگری کی مسروری میں رخنہ نہ پڑا۔ وہ بھاگی بھاگی بھابی کے پاس لوٹ آئی اور آلے سے جلدی جلدی جھنجھنیاں اور چھاگل اٹھا کر پہنے۔ اس نے بھابی کی سبز کشیدہ نما رامپوری ٹوپی اور اچکن بھی ڈانٹ لیا۔ وہ اسی چھوٹی سی جگہ میں زور زور سے پاؤں فرش پر مارتے ہوئے چھم چھم کرتی پھرنے لگی اور فرمائشی ناچ کر بھابی کو دکھایا۔

آج کھلی میرے من کی کلی
کھلی کلی کھلی، اکلی کلی کلی!

اتنے میں اس کا بڑا بھائی مکند ابھی آ گیا اور جب چوکے میں بیٹھے بیٹھے اسے ناگری کے ارادے معلوم ہوئے تو وہ اسے پچکارنے اور گڑگڑا کر منانے لگا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے مجھے سگرٹ فیکٹری میں ملازمت دلوائی تھی پتا جی کو دکان کا سامان خرید کر دیا تھا۔ اور کرپا کو پڑھا رہے ہیں مگر ناگری، ہم تجھے ایک سے لاکھ تک ان کے ساتھ نہ جانے دیں گے۔ تو ان کی مورکھ نہیں۔ انہیں ابھی جا کر کہہ دے کہ صبح اندھیرے دہلی جانے والی گاڑی میں سوار ہو جائیں۔"

"پر بھائی جی، اگر وہ چلے گئے تو یہ گھن جو بیٹھی ہے"

"وہ جانا نہ رہے گا تو ہم کسی طرح اس سے نپٹ لیں گے۔ تو جا انہیں

یہ بہت منا وسے ۔

وہ کوٹھری میں گئی تو اس کے برجستہ برجستہ، خوش آیند چہرے پر دل باختگی اور فکر ہائے دور و دراز کے آثار ظاہر تھے۔ اس کی فرح ناکی اور دل لگی ہوا ہو چکی تھی۔ جب نجمی شریک الرائے ہو کر اسے اپنے ساتھ لے جانے کو تیار ہو گیا تھا تو اس کے گھر والے رکاوٹ بن گئے تھے۔ وہ اپنے باپ کے آنے پر بھی باہر نہ گئی اور کھانا جو کچھ تھوڑا بہت اس کے حلق سے نیچے اتر سکا، نجمی کے ساتھ کھایا۔

نجمی نے اس کی حالت دیکھ کر کہا: "تیری صورت روکھی روکھی، بھنگی بھنگی سی ہو رہی ہے۔ نظر کا جادو اڑا اڑا سا، ہونٹ الونے سے، اور ہنسی ہے پر کھوکھلی۔ اری یہ آخری صحبت بھی غنیمت ہے۔ گھنٹی کی طرح ٹھنک۔ اپنے پرانے داؤں پھر دکھا! ایسی بن جا جیسے دو چلّوؤں میں بہک کر جھانجھ سے مری جا رہی ہو۔ ہنس، ناگری! میرے لئے ہنس۔"

پھر ناگری کو چھوٹے چھوٹے قہقہے لگانے پڑے۔ اس کی شرارت آمیز آنکھیں بار بار بند ہو کر کھل رہی تھیں۔ لیکن اس سے نجمی کی تسلی نہ ہوئی:

"تو چپ کیوں ہے؟"

"جو رات کی رات کا مہمان ہو، اسے دکھ دینا اچھا نہیں ہوتا۔ تم..."

"پھر رک گئی۔"

"جو من میں ہے میرے منہ میں اس کے لئے بول نہیں۔ اچھا، پکفی جی، تم وہاں پہنچ کر کیا بیراگ سادھ لو گے، ہتی ستی ہو جاؤ گے؟ دوستوں کو ہیم

کسل کے خط تو لکھا کرو گے۔"

"ہاں!"

"اور مجھے؟"

"تجھے نہیں"

"جو میں نے کوئی پتر ڈالا تو جواب بھی نہ ملے گا! خیر نہ ملے۔ پر ایک بات تو کر سکتے ہو۔ منظور ہو تو بتاؤں۔"

"بتا!"

"کورے کاغذ پر چیلک کا نشان کر کے بھیج دینا۔"

"میں ایسا بھی نہ کروں گا۔"

تم ایسا کرو گے تو اپن ایسا کریں گے کہ دھیما مندر کی داسی نہیں گے۔ گو کبھی سامنے دھریں گے اور مالا جپا کریں گے۔ اور جو ہمیں مندر میں جگہ نہ ملی تو اسی کوٹھری کو جبہ گاس بنائیں گے۔"

تمہیں پتہ نہیں کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں۔ وہاں مجھے خیالات تک کی پاکیزگی درکار ہوگی۔"

"دور داسی جی، کیا اپنا آپا اتنا لبسرا لو گے۔ اور میں گویا آنکھوں سے دور ہو کر من سے بھی اتر جاؤں گی اور تم مجھے بٹے کھاتے میں ڈال دو گے؟"

"ہاں!"

"ایشور ایسا تو نہ کرے، کیوں کہ یوں بڑے پڑے تو کر جاؤ گے بنیادہ دنوں چاپ چڑھانے سے پشو چرنا اور جگالی کرنا بھول جاتا ہے اور تم

جانتے ہو میں کون ہوں۔"

"ڈولی مچھلی!"

"میں وہ ہوں جو تمہیں پرانے، سنسان نمائش گھر میں ملی تھی۔ جب جھاوٹیں برس کر کھلا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بادل چھپاؤ میں اڑ رہے تھے اور اتنی سردی تھی کہ دھوپ میں آنچ کا پتہ تک نہ تھا۔ تم نے وہاں میرا ہاتھ کیوں پکڑ لیا تھا؟"

"اور تو نے اسے چھڑایا کیوں نہ تھا؟"

"اور جب میں نے پوچھا: کیوں کیا بات ہے؟ تو تم نے اس کا یہ جواب کیوں دیا تھا: کوئی بات نہیں۔"

"تو بات تو کوئی نہیں تھی۔"

"جو بات..... کوئی نہیں تھی۔ تو پھر تمہیں اس سے تھرتھری سی کیوں چھوٹ رہی تھی؟"

"اور تو بند کیے ہوئے پھاٹک میں، جس پر سوا گتم لکھا ہوا تھا، غضب کی پچھاہٹ میں آ کر بلا ضرورت یوں ہی کھانسنے کیوں لگی تھی؟"

"تمہیں وہ ٹھسکا ابھی تک یاد ہے؟"

"مجھے وہ ٹھسکا ہمیشہ ہی یاد رہے گا۔ اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔"

"تمہیں اس دن تھرتھری کیوں چھوٹ رہی تھی اور تم مجھ پر ٹیڑھی سی نگاہ کھڑے ہو گئے تھے: کیوں جی؟"

"تھرتھری جب چھوٹ رہی تھی۔ رگ رہ جاتا جی؟ اور تو اس دن جگنی اور پھلوا

پورین کی طرح گا رہی تھی : سیاں توری گردی میں گیندا بن جاؤں گی - آج بھی گا !"

"گاؤں گی، جو تم میرے ساتھ گاؤ، جس طرح جگنی اور پھلوا پور نہیں گایا کرتی ہیں -" پھر وہ گانے لگی :-

" سیاں تیری گودی میں گیندا بن جاؤں گی
جو مورے سیاں کو پیاس لگے گی   گنگا جمنا تربیتی بن جاؤں گی "

" اور میں وہ زمانے بھی نہیں بھولا جب ٹیسو کے دنوں میں سوراخ دار ہانڈی کے اندر چراغ جلائے اور اسے سر پہ دھرے تو جھا جھی والی ہندو لڑکیوں کے ساتھ گیت گاتی پھرا کرتی تھی "

" تو پھر ہمیں من سے اتار کر کسی اور کو من میں نہ بسا لینا - مجھ ایسی دل کی سادی لڑکی تم کو ملنے کی بھی نہیں - اچھا مجھی جی، تمہیں میری، کوئی اور چیز یاد آئی تو کیا یاد آئے گی ؟"

" تیرا اترانا -"

" اور کچھ نہیں ؟"

" اور کچھ نہیں - کیونکہ تیرے پاس یہ ایسا منتر ہے کہ جس کا اتار ہی نہیں "

۷

یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ ناگری کی بھابی نے دروازہ کھٹکھٹایا، اور سرگوشی کی : " تیرے بھائی جی نے گلا گھونٹ کر ٹھونٹنی کے پران پھڑا دیئے ۔

وہ مری پڑی ہے ۔"

"مری پڑی ہے ؟ ہائے بھائی جی !"

"اس کے پران چھڑا دیئے اور کرتے بھی کیا ۔ اور دیکھ ، اپنے بلم کو کہہ دے کہ اب چلا جائے ۔ تیرا بھائی بھمو کی لاش منگوائے گا ۔"

" پر بھابی ، آدھی رات ہونے آئی ۔ اب وہ گھر سے نکلے تو کہیں ڈنڈے والے سپاہی ان سے سوال و جواب نہ کریں ۔"

"محلے میں نوٹنکی کا تماشہ ہو رہا ہے ۔ یہ ڈھولک اور گانے کی آواز نہیں آ رہی ؟ اچھا موقع ہے ۔ نکل جائیں کوئی پوچھے تو کہہ دیں گے : تماشہ دیکھ کر آ رہا ہوں ۔"

اندر جا کر وہ متوحش اور بے کل نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ، اداس جی سے تھرتھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی ، "سوامی بھائی جی نے گلا گھونٹ کر بھمو کمنی کے پران چھڑا دیئے ۔ وہ مری پڑی ہے ۔"

"میں اسے جانتا ہوں ۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتا ۔ میاں بیوی کی میری وجہ سے کٹا چھنی ہو گئی ۔ پہلے اس بچی ہوئی کوٹھری میں سویا کرتے تھے ۔ بعد کو اس کوٹھری میں پڑنے لگے ۔ اور جب بھمو وہاں آ بیٹھی تو یہ بیچارے کہاں جائیں ! خبر نہیں ، دونوں میں کب سے ہانڈی پک رہی ہو گی کہ مجھے کیسے راستہ دکھائیں ۔ میں انہیں دوبھر ہو گیا ہوں ۔"

" نہیں سوامی ، وہ مری پڑی ہے ۔ بھائی جی اسے منگوا دیں گے ۔ تم جاؤ ۔ جانا ہی اچھا ہے ۔ کہیں تم پہ خون کا الزام نہ لگا دیں ۔"

"وہ مری نہیں ۔ سندچاہے تو کوٹھری میں جاکر دیکھ آ۔"

"میں! مجھ سے کوٹھری کی طرف دیکھا بھی نہ جائے گا۔ سوامی، اٹھو، سب کھیل بھنڈ ہو چکا۔ دیپک کی بتی جل چکی ۔ اندھیرا لگ رہا ہے ۔ میں تمہیں اپنے گھر سے کھیدڑ رہی ہوں ۔ تمہارے دم قدم سے یہاں آبادانی اور ہریالی تھی ۔ بہت دنوں کھبہ تر رہ چکا ۔ اب مجھ میں یہ مقدور ہی نہیں کہ تمہیں ٹھہرا سکوں ۔ پرماتما کے لئے یہاں سے چلے جاؤ ۔ میں تمہیں اشیرباد دے رہی ہوں ۔ ایشور تمہارا بول بالا کرے ۔ بیوگیوں کو پھر ملائے ۔ جو تمہارا پنچھی پائن پیٹ پیٹ کر نہ مرا اور باٹ دیکھتے دیکھتے آنکھیں نہ دو کھیں تو ایک دن درشن ہو ہی جائیں گے ۔ دیوتا کر من کی آس میں بٹھلا کر پوجا کرنے کا سماں آ رہا ہے ۔ پھول بتاشے چڑھانے کا سمے سہاپت ہوا۔"

"جو تمہاری آگیا ہوتی تو میں گنگا منہ میں رکھ کر تمہارے پاس اڑی چلی آتی ۔ وہ نہ ملتا تو ویسے ہی بے چوک اور بھاگا بھاگ پہنچتی ۔ اور تمہارے گھر آن پڑتی ۔ تمہارا یہاں اتنے دنوں ٹھہرنا بھی اس جنم جلی کی دھک دھکی نہ مٹا سکا ۔ میں ایک رات بھی کھلے کواڑوں نہ سو سکی ، اور سنتوش تو کہاں ، مجھے ایسا جان پڑ رہا ہے جیسے میری کمر پہ کنکھجورا چڑھ گیا ہو اور ابھی ابھی اپنے پیر میرے ماس میں گڑو دے گا ۔ ایسی چل چلاؤ ملاقات میں کیا ہوا ۔ بھول سے ہو کر ملیں تو سواد اس میں ہی ہے ۔ رام جانے یہ سمے کب آئے گا اور اب تو کڑے کیسلے دن شروع ہوا چاہتے ہیں ۔ یہ دل تو ابھی سے پسا جا رہا ہے ۔ آگے جاکر کیا ہوگا : جب اس میں غم کی چھاؤنیاں پڑ جائیں گی ۔"

اب پوس گزرا جا رہا ہے۔ پھاگن میں گورت کے ہکوے کھلیں گے۔ چیت میں آم مہکے گا۔ بیساکھ میں طرطے تن کے کوٹر میں بچے نکالیں گے۔ پھر وہ تپے گا کہ دھرتی لال ہو ہو جائے گی۔ ساون روتا ہوا آئیگا، روتا ہوا جائے گا، سلونو کی مجھے خبر تک نہ ہو گی۔ میں تو یہ بول گاؤں گی، دن مرین آنسو بہاؤں گی: "

لگا میگا ہو چھم چھم میگھ برسے — ہمن کا جیو پیو دیکھن کو ترسے
چڑھا ساون، لگی آنے جھنبھیری — نہ آئے کنتھ اب تا ٹانے سکھی ری
اندھیری رین، برسے ہے گھنگھور — کریں ہیں داور اجھنگرائے کے شور
سکھی جب کوک کوئل کی سنت ہوں — اٹھا کے سیس ماتی پہ دھرت ہوں
چلا ساون بھی اب دکھ دے کے دونا — نہ آئے پی، رہا منڈل پہ سونا

تم نہ آئے تو میں کاتک میں کروا چوتھ مناؤں گی۔ ہائے، وہ پار، ایسا تو نہ ہو، تمہیں چیت میں رام نومی یہیں آکر کرنی چاہیئے۔ ہولی پھکنے سے پہلے ہی آجانا۔ پھر ہم دونوں دھلنڈی منائیں گے۔ تم مجھ پر رنگ بھری پچکاریاں چھوڑ کر اپنی رانی بازار والی حویلی میں چلے جاؤ گے، تو میں پیچھے گاؤں گی:۔ سانورا ڈار گیا موری انکھن بیچ عبیر۔

"سوامی" مجھ سے ایک دن بھی پھیل پھیل کر نہ سویا گیا۔ میں کبھی تریت نہ ہوئی۔"

"پھیل پھیل کر کیسے سوتی؟ جب ایک بستر میں دو ہوں تو پھیل پھیل کر نہیں سویا جایا کرتا۔ اور وہ کیوں ہمہی ہے؟ اسی لئے؟"

"نہیں، اس لیے نہیں! گرمیں کا رونا ہے۔ بہتیرا دل کڑا کیا، پھر بھی کچھ ٹیسوے ٹپک ہی پڑے۔ آنکھیں بھی کھٹک رہی ہیں۔ میں وہ سات پنچھی مار کر نہ ہی اڑاتی تو اچھا تھا۔ کچھ تو آس رہ جاتی۔ دل میں اتنا دھواں تو نہ اٹھتا۔ جب تم نے کہا تھا میں ابابیل اڑنے سے پہلے ہی لوٹ آؤں گا۔ تو میں نے دو ابابیلیں بھی کوٹھے پر جا کر اڑائے تھے۔ وہ تک بھی تو نہ لوٹے۔ بس بیوگ پڑنے والا ہے۔"

"ایسی اول جلول باتیں کر کے اپنا جی نہ بھاری کر۔"

"ایشور کرے تم وہاں اچھلے گھلے پھرو۔ تمہیں وہاں رہنا بسنا اور راج رچانا نصیب ہو۔ میرے کون سے پران نکلے جا رہے ہیں۔ تم بن اکلاؤں گی ضرور، دم بھی پھڑکے گا! مگر کال یا تر اکے کالے کوس پھر بھی کٹ ہی جائیں گے۔"

۸

عجمی باہر چلا گیا اور اندھیری کوٹھری کی تلاشی لینے لگا۔ بھائی اور بھابی کا پلنگ خالی پڑا تھا۔ پھمّو کٹنی کا وہاں پتہ بھی نہ تھا۔ اگر وہ مل جاتی تو عجمی ضرور اس کا گلا گھونٹ دیتا۔

پھمّو کو موجود نہ پا کر اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ سانس چڑھائے ہوئے کوٹھری میں جا کر ناگری سے بولا۔ "وہ تو وہاں سرے سے ہے ہی نہیں۔"

وہ گھبرائی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس نے کوٹھے پر مکندا کو بلا کر کہا: "بھائی جی، وہ......"

"میں نے گلا گھونٹ کر اس کے پران چھڑا دیئے، اب اسے جلدی ہی سنگوانا ہے۔"

"پر بھائی جی......"

"تو کہہ دے، وہ نکل جائیں۔ یہ نرتکی کا تماشہ ہو رہا ہے۔ اچھا بہانہ ہے۔"

"پر بھائی جی، وہ وہاں کوٹھری میں نہیں۔"

یہ سن کر مکندا عجیب انداز میں بولا: "بے وقوف، مری ہوئی کہاں جا سکتی ہے؟ میں نے تو چارپائی پر ڈال کر اس کا گلا گھونٹ دیا تھا بھوتنی کہیں کی۔ ذرا سے دیکھنے جا کیسے سکتی ہے، ڈرپوک، پاتر گھبرا رہی ہے!"

"میں نہیں گئی، وہ گئے تھے۔ انہوں نے کونا کونا چھان مارا۔"

"اچھا جا میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں۔ تو انہیں میرا پرنام دے کر کہہ دے کہ وہ فوراً چلے جائیں۔"

ناگری فوراً چلی گئی۔ مکندا نے کوٹھری کو پہلے تو اندھیرے میں ٹوہا ادھر ادھر کو دیا، پھر سے کر دیکھا بھالا۔ بھوگتنی کوئی سوئی تو نہیں تھی۔ کوٹھری کا بہت سا سامان بھی غائب تھا۔ مگر جلد ہی اس کی نگاہ دیوار کے پار پر پڑ گئی۔ یہ اس کے جاگنے کا راستہ تھا۔ اس نے سیندھ لگائی کیسے ہو گی؟ ہاتھ پاؤں تو بندھے ہوئے تھے۔ آلات نقب زنی کہاں سے آ گئے؟

پھر اس نے عقل پر ذرا سا زور دیا: "یہاں تو چور آئے تھے۔ نقب باہر سے لگائی گئی ہے ملبہ تمام باہر ہی ہے۔"

ملندا اپنی بیوی کے پاس پہنچا۔ کٹنی کی کہانی گھڑنے میں ان دونوں کی ملی بھگت تھی۔ وہ واقعی ایک دوسرے کو ترس گئے تھے۔ ان کی شادی دیوالی پر تو ہوئی ہی تھی اور ابھی ہولی میں مہینے بھر سے زیادہ پڑا تھا۔ پر اب خطرہ انہیں بالکل نزدیک نظر آیا۔ مغرور ملزم ناگری کے پاس سے پکڑا گیا تو گھر بھر کی خیر نہیں تھی۔

ملندا نے اپنی بیوی کو بھیجا کہ وہ ناگری کو کہہ کر جگمی کو فوراً چلتا کرا دے۔ کچھ دیر بعد وہ ناگری کو سنبھالے ہوئے لا رہی تھی۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ تبارے ہی فرش پر گر گئی تھی۔ اس کے گھٹنوں سے خون نکل رہا تھا۔ پھر ملندا کوٹھری میں گھس گیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا: "جگمی جی، بڑا غضب ہو گیا! جیمل نے سیندھ لگائی تھی...... وہیں سے بھاگ گئی۔ پولیس آیا چاہتی ہے۔ جلدی کیجیے۔" وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

اس کے پیچھے پیچھے ناگری بھی دھاڑیں مار مار روتی ہوئی گلیارے میں دوڑ گئی۔ وہ میٹھی ہوئی آواز میں بین کر رہی تھی۔ "ہائے، جوگی بنا منڈھیا سونی ہو گئی۔ باگ باڑی اجڑ گئی باڑی اجڑ گئی۔ مجھے سسکتی کو چھوڑ گئے۔ ہے ہے میرے پران ان کے سامنے ہی نکل جاتے تو اچھا تھا۔ جس کے لئے اپنا آپا تجا تھا۔ وہ جیتے جی چلا گیا۔"

ملندا اسے روکنے کے لئے بھاگا کہ کہیں یہ بھی جگمی کے ساتھ نہ چل دے۔

مگر وہ سفر خرچ کے لیے چپکے سے سو روپے کا نوٹ، زادِ راہ کے لئے رومال میں بندھے ہوئے بوندی کے پاؤ سیر سے لڈو عجمی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے واپس آ کر کوٹھے پر چڑھ گئی تاکہ گیس کی تیز روشنی میں، جو ٹونگی کے تماشے والوں نے کی تھی، عجمی کو جاتا ہوا دیکھے۔ وہاں سے اسے عجمی تو نظر نہ آیا مگر سامنے زہرہ ستارہ اماوس کی رات میں اس طرح چمک رہا تھا جیسے اس نے آسمان میں چھید کر دیا ہو۔ ہندو زہرہ کو منحوس مانتے ہیں۔ وہ یہ کہتی ہوئی نیچے آگئی:

"پیا کو بدا کیا تو سوکن سامنے ہے۔ رام بھلی کرے۔ میرے من کا نگ اچھلتی ہوئی گنگا کی منجدھار میں گر پڑا۔ اب اسے کون نکالے۔" وہ ابھی سیڑھیوں ہی میں تھی کہ یا ہو بولنے لگے۔ ان کی آواز بھی بڑی شیون آلود اور درد بھری تھی۔

ذرا دیر بعد ڈھولک اور گانا بند ہو گیا۔ ٹونگی کا تماشہ دیکھنے والے مجمع کو سڑک سے ہٹاتی ہوئی مسلح پولیس کی دو لاریاں گھڑگھڑاتیں سرداری کھٹیک کے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئیں۔ گھر کا محاصرہ کر لیا گیا اور بلا آواز یا اطلاع دیئے جوشی تھانے دار مع پولیس کپتان اندر داخل ہو کر سیدھا ایک مسہری والی کوٹھری میں جا پہنچا۔ وہ اب بھی اگربتیوں اور گجرے سے مہکی ہوئی تھی۔ ناگری کا سنگھار دان کھلا ہوا تھا۔ ناگری جھکول پھکمل رتی ہوئی اس میں سے عجمی کے دو پاسپورٹ سائز فوٹو نکال کر قمیص میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جوشی نے جاتے ہی اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر تلاشی لینی شروع کر دی اور سب سے پہلے فوٹو برآمد کر لئے۔ پھر اس نے بستر ٹٹولا۔ وہ گرم تھا۔ گلہرے میں تازہ پان بنے رکھے تھے۔ مگر تمام آثار پھمّو تحسین کی مخبری کے مطابق موجود ہوتے ہوئے بھی مدعا

غائب تھا۔ لیکن ناگری جرم اخفا بالعمد کی مرتکب ہو چکی تھی۔

کچھ دیر بعد نوٹنکی کے تماشائی سرداری کھٹیک کے تمام خاندان کو جالیو والی لاری میں جاتا ہوا دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔ گو سڑک پر گیس کی تیز روشنی تھی مگر نظر خاک نہ آسکتا تھا۔

ناگری نے اس وقت کو کئی کرتی پر سونے کی دھاریوں والی جیکٹ پہن رکھی تھی اور منقش والا کسمبھے رنگ لہنگا۔ اس کا آفت روزگار چہرہ فق ہو کر چھپا سا نکل آیا تھا۔ پہاڑی جوشی اس کی اس طرح نگہبانی کر رہا تھا جیسے اس نے قتل عمد کیا ہو۔ اس کی سات سہیلیوں کے جھمکے سے بھی زیادہ چمک دار آنکھیں رونے کے سبب الٹی ہوئی تھیں۔ رنگ پریدہ پریدہ، ژولیدہ ژولیدہ اور جوڑا کھلا ہوا۔ وہ ایک ہاری دکھیاری اور یتیم دودھ سا لگ رہی تھی۔ وہ ٹھنڈ میں کھڑی ہوئی ایسی لاوارث بیری معلوم ہو رہی تھی جس کے بیروں پر صبح سے شام تک شہر کے بچوں کا گودھڑا برستا رہا ہو۔ اور وہ گھسٹتی ہوئی چھوڑ دی گئی ہو۔ رونے کے سبب اس کی اب بھی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔

ادھر محل کے پھاٹک پر پولیس لاری کے انجن میں فرق آگیا۔ جب لاری ٹھہرا کر انجن ٹھیک کر رہے تھے تو نوٹنکی کی محفل پھر جم گئی۔ اس وقت ہیجڑے تالیاں بجا بجا کر گا رہے تھے۔

جھمکا گرا رے بریلی کے بازار میں!!

نندا بھی ڈھونڈے اسا سو بھی ڈھونڈے

سیاں ڈھونڈے رے مٹی کا دیا بال بالی

جھمکا گرا رے بریلی کے بازار میں !

گارڈ کے سپاہی اس گانے کی مقامی اور بانکی دھن پر لاری میں بیٹھے ہوئے تالیاں بجانے لگے اور پہاڑی جوشی نے مستی میں آکر اپنا ہاتھ ناگری کی سانتقل پر رکھ دیا۔ ناگری کچھ بھی تو نہ بولی البتہ ہاتھ پر سے ہٹایا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کا جھمکا تو کہیں بھگریا گھر کے بازاروں میں جا کر گرے گھجا اس کا یہ جھمکا بریلی یا مکھنئو کے بازار میں گرتا تو وہ اسے ڈھونڈ ہی لاتی۔ وہ منہ ہی منہ میں گا رہی تھی :

جیا اٹک رہا ہے تجھ میں
ترے درس کو نین ! !

(سویرا لاہور)

الائچی دانہ

محبوب ملازم نے پٹ کھولتے ہی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا: "کوئی باورچی خانے کی طرف چوبی کھڑکی کھٹکھٹا رہا ہے۔ پتہ نہیں کون ہوگا۔ اسے کھٹکھٹاتے ہوئے دیر ہوگئی ہے، بڑی آہستہ سہج سہج کھٹکھٹا رہا ہے۔" میرے دل نے فوراً کہا "الائچی دانے والی آگئی۔" واقعی وہ آگئی تھی۔ میں اسے چوبی کھڑکی سے ہی گودی میں اٹھا کر لایا۔ کمرے میں بجلی کی ٹیوب کی تیز مہتابی روشنی تھی جس میں پھول دار جامنی قالین دہک رہا تھا۔ جب میں نے اس پر سے نجانے کی سمندلوئی آنا رہی تو دیکھا، اس نے لباس تیراکی ایسی ریشمی شمیز پہنی ہوئی تھی، جس کا رنگ پہاڑی کستوروں کے پروں ایسا تیلیا نیلا تھا۔ اس کے گریبان، پلوں اور کفوں پر تسبیح کے امام ایسے دانے جھالر کی طرح آویزاں تھے۔ نچلے حصے پر بھی اس قسم کا نیکر نما جانگیہ تھا۔ وہ خوب بناؤ کر کے آئی تھی۔ اس کے جسم کی جھکا جھک چکنا ہٹ اور بلور کو کیا کہیے سائی ورمی کوسٹ میں جیسا کہ اس کا نام ظاہر کرتا ہے اگر ہاتھی دانت کی تجارت ہوتی ہوگی تو وہاں کے تاجر ایسا کھرا ہاتھی دانت آج تک کبھی برآمد نہ کر سکے ہوں گے۔ میں نے تمہیداً

اس کے نچلے ہونٹ کا ابھرواں سا شنگرفی شعشعہ چومتے ہوئے گدے دار بستر میں لٹا دیا۔ اس بستر کی ریشمی چادر گاڑھے مکھن کے ہم رنگ تھی، جس میں سبز، سرخ اور زرد پھول کڑھے ہوئے تھے۔ پہنی اوڑھی وہ پتلی سی معلوم ہوتی تھی لیکن یوں لیٹے ہوئے اس کا جسم بھرا بھرا لگتا تھا۔

ہندو لوہڑی کا تہوار منا رہے تھے جس طرح مینہ کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس زور کا برس رہا تھا کہ آج برس کے پھر کبھی نہیں برسے گا، سردی اتنی پڑ رہی تھی کہ جتنی بھی پڑنی ہو بس آج ہی پڑ لے۔ ہفتہ بھر مہاوٹیں برسنے کے بعد شام کھلا تھا۔ ایسی دھوپ چل رہی تھی جیسے یہ پتوں کو چھلنی کر رہی ہو۔ دھند میں آیا ہوا اکادش کا چاند تک کانپتا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ شملہ سے سو میل اوپر سراھاں کا رہنے والا گرمکھ سنگھ چوکیدار اپنے سمور دار اوورکوٹ میں اتنا جاڑا محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے سوسی کی معمولی روئی دار جیکٹ پہنی ہوئی ہو۔ مگر میرا کمرہ ہیٹر کی بدولت ایسا گرم تھا کہ جب مہمان کی شمیز کے فتوحی نما بٹن میرے ہاتھوں پٹ پٹا کر کھلے تو اسے ذرا بھی جاڑا نہ لگا۔ مجھے وہ اس اٹانگ دم باز کبوتری ایسی معلوم ہوئی جسے صبح کو اڑائیں تو شام کو اترے اور سردیوں کی ٹھنڈی دوپہری میں دور آسمان پر کالے بادل تلے سفید تارا سا لگے۔ اس کے جسم پر ایک رتی بھر گوشت زیادہ نہ تھا اور نہ ہی کم تھا۔

ہمارا اور اس چوبر کھڑکی سے آنے والی کا کاٹیج دونوں اس طرح سے پاس پاس تھے جیسے مندر کے دو...... چھوٹے بڑے گنبد۔ ہمارا کاٹیج بلند زیادہ تھا اور ان کا زیادہ وسیع۔ شمال میں تارکول کی سڑک تھی، جنوب مغرب

میں پانچ میل اوپر درہ ساویراں سے نکل کر اس اڑ بڑ پہاڑی تک پہنچتی تھی۔ جسے "دلِ عاشقاں" کہتے تھے۔ اس پہاڑی کے کنٹھے ایسی سپاٹ مستک کی چار کھونٹوں سے چار چشمے پھوٹتے تھے، بیچ میں سدا بہار دیوداروں کی ٹکڑی تھی، یہی چار چشمے یک جا ہو کر مستک سے بشکل آبشار زاویہ قائمہ بناتے ہوئے پائیں کوہ پر گر کر ٹیڑھے میڑھے نالے میں مل جاتے ہیں۔ اس آبشار کی آواز دور دور تک جاتی تھی۔ جو محبت کے بندے اسی اڑبڑ پہاڑی پہ اگی ہوئی تلخ پریم بوٹی ایک دوسرے کے ہاتھ سے بلا منہ بنائے ہوئے کھا لیتے تو ان کا رشتہ اٹوٹ ہو جاتا تھا۔ لیکن جو ان میں سے ایک بھی منہ بنا لیتا تو پریم بوٹی ان دونوں کے لئے ہمیشہ کو بے اثر ہو جاتی۔

تار کول کی سڑک کے پار گوردوارہ تھا۔ گوردوارے سے ملحق وہ ہزار فٹ سے زیادہ اونچی دیوداروں سے ڈھکی پہاڑی تھی، جس سے نکل کر فتح پنجاب کے زمانے میں سکھ چھاپہ ماروں نے لال کرتی رجمنٹ کے قہرمان دستے کا صفایا کیا تھا اور پہاڑی برطانوی توپیں چھینی تھیں۔ آج اسی گوردوارے میں جس کا گرمکھ سنگھ چوکیدار تھا فتح خالصہ کی یاد منائی جا رہی تھی۔ دیوان منعقد تھا۔ طلبہ ہارمونیم پر بھجن گائے جا رہے تھے۔ اور ایسی خاموش فضا میں جب کہ یہاں سے چند میل دور درہ ساویراں برف سے اٹ کر بند ہو چکا تھا۔ اور وہاں اب بجری پڑ رہی تھی، نرمی گانا ہمارے کمرے میں ساحل پہ آ کر کمزوری اور بے طاقتی سے مرتی ہوئی لہروں کی طرح سے داخل ہو رہا تھا یہ گویا ہمارے رومانوی ملاپ میں پس منظر کی موسیقی تھی۔ جنوب مغرب میں

دل عاشقاں سے آنے والا ٹیڑھا بیڑا پہاڑی نالہ دھاں دھاں کرتا ہوا گزر رہا تھا۔

جب میں آنے والی کی خفگی دیکھ کر بے تابانہ پیش دستیاں کرنے لگا تو وہ مچھلی کی طرح بستر میں سے تڑپ کر اٹھی اور آرام کرسی کے چوڑے ہتھے پر بیٹھتے ہوئے بولی:۔

"ہے ہے ہے وند مت مچاؤ۔ دنگے بازی مت کرو، آؤ کچھ باتیں کرلیں۔"

"تم کوٹھے سے میرے الائچی دانے کیوں مارا کرتی تھیں؟"

"تم کیوں انگنائی میں دھوپ سینکتے ہوئے ہمارے کوٹھے کی طرف دیکھتے رہا کرتے تھے؟"

"تم سے ملنے کے لئے۔ تم نے کبھی اشارا تک بھی تو نہ کیا۔"

"کرتی کیسے؟ وہ جو ہر وقت ساتھ ہوتی تھی۔"

"کون گندمی رنگ کی لڑکی؟"

"جب میں تمہاری طرف الائچی دانے پھینکنے لگتی، تو وہ جلتی تھی۔"

"کیوں"

"وہ چاہتی تھی، میں حئی سے شادی کرلوں جو اس کا ممیرا ہے۔"

"تو حرج کیا تھا۔ وہ تو آج لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔ ہمالہ کے پہاڑوں میں ہوٹل ہمالیہ سے بہتر ہوٹل اور کوئی تو نہیں۔"

"جی! تو ایک نواب زادی ہوٹل والے سے بیاہ کرے، جو دودھ جو

جو ہے ۔"

"اور میں کون ہوں ؟"

"ہوٹل والا ؟ اور وودھا جو ! جاؤں آپ کے پاس سے ؟ تم تو گھر میں بھی رکھ رکھاؤ کا لباس پہنتے تھے ۔ اتنی تھوڑی عمر میں وودھا جو بھی ہو گئے ۔"

"ٹھہرو ! ٹھہرو ! نہ میں ہوٹل والا ہوں ، نہ وودھا جو ۔ میں تو ان چھیڑ اور اچھوتا رہوں ۔ میری بہن کالج میں لیکچرار ہے ۔ میں اس کے ساتھ یہاں آیا ہوا ہوں ۔"

"تم نے اپنی بہن سے نوکری کرا رکھی ہے ؟"

" ابھی گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ محبوب پھر دروازہ کھٹکھٹانے لگا ۔ میں نے اندر ہی سے پوچھا ، "کیا بات ہے ؟"

تو اس نے جواب دیا "کوئی پھر چوپر کھڑکی کھٹکھٹا رہا ہے ۔"

" یہ سنتے ہی مہمان کے چہرے پر فاختہ اڑنے لگی ۔"

اس نے کہا : "میں جاتی ہوں ۔" اور بلا اجازت یوں ہی سنجاف لگی سمند چادر اوڑھ کے صدر دروازے سے باہر نکل گئی ۔ دروازے تک میں بھی اس کے ساتھ گیا ۔ صحن میں کھڑے ہوئے دیدہ دار ہوا میں سائیں سائیں کر رہے تھے ۔ گوردوارے میں اس وقت کورس پر جنگی ترانہ جوش و خروش کے ساتھ گایا جا رہا تھا ۔ جس کے آخری بول تھے "راج کرے گا خالصہ" سکھ یہ بول دوہرا دوہرا کر ادا کر رہے تھے ....

اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس جانے والے حسین شہر یار کے جسم و جان پر راج کرتا۔ خواہ وہ راج ایک رات کی سلطنت ہی کیوں نہ ہوتی۔ میں اس تھوڑے سے عرصہ میں خوب چام کے دام چلاتا۔

جب میں کمرہ میں واپس آیا تو وہی گندمی لڑکی اُجھکتی ہوئی سی اندر داخل ہوئی۔ میں آرام کرسی سے تکیہ لگائے بغیر ہی کھنچا کھنچا بیٹھا اور وہ اپنے بیضوی چہرے کی بادامی پتلیوں والی ہوتی چپر رنٹ کھٹ آنکھوں سے میری طرف اس طرح سے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ "اسے تو دیکھا ہے۔ ذرا مجھے بھی دیکھئے۔ میٹھا تو کوئی چند مرتبہ ہی کھا سکتا ہے اور نمکین ہمیشہ۔ وہ فطیری ہے تو میں خمیری ہوں"

اس کا رنگ کھلا گندمی نہ تھا بلکہ وہ تو ململ ململ دھیلی دھیلی اچوت سی تھی۔ گندمی سے سانولا بن جانے میں صرف ایک ڈیڑھ سوت کا فرق ہوگا۔ یعنی یہ معلوم کرنے میں کہ کس کا پلڑا بھاری ہے ہیر پھیر کر تولنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ میں نے اسے ٹھہرنے کے لئے نہیں کہا کیونکہ پہلی سے میری محرومی کی ذمہ دار بھی یہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے غصہ غصہ تھے، نہ وہ بات کر رہی تھی نہ میں۔ بس ایک دوسرے کو چپ چپ دیکھ رہے تھے۔ میں نے تو گویا اس سے نہ بولنے کی قسم کھالی تھی۔ جب آدھ گھنٹہ یوں ہی گذر گیا تو اس نے گویا تھکن سے ٹانگیں سی بدلتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا۔

"منی کہاں ہے آبا غ و بہار"

"باغ و بہار کی باتیں مالی سے پوچھئے۔ اس کا کوارٹر دیہ داروں کے پاس

ہے۔ آپ تشریف لے جا سکتی ہیں۔"

"میں تو منی کو پوچھتی ہوں جو آپ کے الائچی دانہ مارا کرتی تھی۔"

"کیوں کیا تم اس کی محافظ ہو؟"

"وہ میری دوست ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گی کہ ادھر کبھی نہ آتا۔ یہ بڑے نوابزادے کھرے اور درشت ہیں۔ اپنے مہمانوں کو کھڑے پیر کا روزہ رکھوا دیتے ہیں۔"

"لیکن ہاں ہوٹل والے کے پاس چلے جانا۔"

"اتنی ذرا سی دیر میں وہ اتنی بے تکلف ہو گئی تھی کہ یہ تک بتا دیا؟"

"نواب زادیوں کے لئے آپ کو بھی ایسے ہی للو پنجو تلاش کرنے تھے؟"

"وہ للو پنجو ہیں۔"

"نہیں آپ کے عزیز۔"

اگر وہ میرے پاس ٹھہرتی تو میری چڑچڑاہٹ سے اسے حبس النفس ہو جاتا۔ جس طرح کوئی سہی گویا اپنے کانٹے کھڑے کر کے غصہ کا اظہار کرے۔ وہ یوں سوچی پھولی گیا سامنہ بنائے ہوئے جانے لگی تو میں نے اس کا پلہ پکڑ لیا۔ اور گدگدیاں اٹھا کر اسے اچھلانے کی کوشش کی۔ لیکن میں اپنے ہاتھ اس کے پیٹ پر دو تین مرتبہ ہی پھیر سکا تھا کہ وہ پلا چھڑا کر بھاگ گئی۔

میلے گندمی رنگ لڑکی کے جانے کے بعد مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔

یہ خوف ہو رہا تھا کہ اس نے مغنی سے میری غیر رسمی ملاقات کی بدگوئی اس کے فوجی نما بھائیوں سے کر دی ہو گی اور وہ ابھی بندوقیں چھپائے ادھر آ رہے ہوں گے۔ میں بلا محبوب کو خبر کئے دروازہ کھول کر سڑک پر نکل گیا۔ گوردوارے کی موسیقی مجھے اپنی طرف شمال میں بلا رہی تھی۔ لیکن میں مغرب میں درہ سادیران کی جانب گامزن ہو گیا۔ جب میں کوئی ادھ میل سے کچھ زیادہ فاصلہ طے کر چکا تو گوردوارے کی موسیقی بند ہو گئی۔ دیودار کا بہت گھنا سہمناک چکٹ سیاہ پرانا جنگل شروع ہو گیا اور میں نے پیچھے سے آہٹ سی سنی۔ مڑ کر جو دیکھا تو مغنی تھی۔ ہیبت زدہ سی اور منواحش۔ اس کی ہیئت سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے سب راز افشا ہو چکا ہے۔ اس نے بڑے بڑے چوکھونٹے بٹنوں والا اوورکوٹ اور مردانی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ اس نے کہا: "پہاڑی دل عاشقاں پر اب بھی پریم بوٹی ہو گی۔"

"نہیں۔"

"اس کی جڑیں تو ہوں گی۔؟"

"وہ تو اور بھی زیادہ اڈوی ہوتی ہیں۔"

"میں تو پھر بھی منہ نہ بناؤں۔ اور تم؟"

"میں کیوں بناتا۔"

"آؤ پھر وہیں چلیں۔"

"درہ برف سے اٹا ہوا ہے۔"

یہاں سے ہم لوٹنے لگے۔ جب ہم ترہ نی کھونٹی پر پہنچے جہاں برطانوی "شہدا" کی یاد میں چھوٹی سی گرجا نما مخروطی لاٹ بنی تھی اور اس کے نچلے حصہ میں چار طرف لمبی عمیق لمرکوں والے دروازے تھے تو معنی نے خود بخود اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔

ترہ نی کھونٹی کے دونوں طرف دو آبشاروں نے شور مچار کھا تھا۔ اور سامنے وہی ٹیڑھا بیڑا پہاڑی نالہ دھائیں دھائیں کرتا ہوا جھلملا سارہا تھا۔ جو ہماری جائے رہائش سے جنوب مغرب میں گزرتا ہے، اور جسے "دل ناشاد" کی پرکرما کا فخر حاصل تھا۔ یہیں سڑک سے ذرا ہٹ کر کھوہ میں سوکھا جھرکٹ اور گھاس جمع تھی جنہیں ہم نے اٹھا لا کر ماچس دکھائی تو بھک بھک جلنے لگی۔ آگ کی روشنی میں اس کی معشوقی اور ہی طرح کی لگی۔ اس وقت اس کے چہرے کا جگمگا یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ چندر لیکھی ہو۔ پھر ہم نے دیکھا سامنے سے کوئی گھوڑا دوڑاتا ہوا اچھلا آرہا ہے۔ وہ ہمارے پاس سے اس طرح گزرا جیسے گھڑ سوار کھونٹا اکھاڑنے کے لئے گزرے۔ ہم جلتی ہوئی آگ چھوڑ کر گھر کی طرف چل دیئے اور سوار نے مشق اس وقت تک جاری رکھی جب تک گورہ وہ ہم سے سو گز کے فاصلہ پر نہ رہ گیا۔ یہاں سے سوار نے درگھال کی راہ لی جو جنوب میں کانتی کھڈ کے پاس نیچی نیچی دیواروں پر سپاٹ ٹین کے کھنڈرے سے تھے۔

جب میں گھر لوٹا تو اکادشی کا چاند بدستور دھند میں آیا ہوا تھا۔ معنی کے کاٹیج کا مرغ باد نما جنوب کو منہ کئے کھڑا تھا۔ کیونکہ اب برفانی ہوا پہلوں سے

ساتھ چل رہی تھی۔ میں خالی کمرہ میں پہنچا تو وہاں اب تک روشنی ہو رہی تھی۔ اور گرمالہ بھی کام کر رہا تھا۔ میں بستر میں لیٹ کر بہت دیر تک اس کی چونچلوں بھری آنکھیں اور چہروں بھرے ذرا دبیز سے ہونٹ یاد کرتا رہا لیکن اب میں پہاڑ پہ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اس لئے اگلی صبح دن نکلنے سے بھی گھنٹہ بھر پہلے، ٹھنڈے ٹھنڈے اندھیرے میدانوں کے لئے روانہ ہو گیا۔

اپنے شہر میں پہنچ کر مجھے کئی ماہ تک مغنی کا چسکا لگا رہا لیکن طبیعت ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر گئی۔ دو سال بعد سردی کے موسم میں یہاں بھی ایک ہوٹل یمانی کھلا۔ میں نے اس کے اشتہار صبح کے اخبارات میں پڑھے۔ اب وہ مجھے لوٹ کر یاد آئی اور ٹکین سے جی اسلٹنے لگا۔

میں اسی شب خوب دیر ہوتے ہوٹل یمانی کے ریستوران میں گیا۔ وہاں اب تک خوب چہل پہل تھی کیونکہ سونے کے نئے زیور کی طرح چمکتی کاونٹر پہ بل کاٹنے والی لڑکی مغنی نے اپنے حسن عالم تاب سے ایوان روشن کیا ہوا تھا۔ اس نے مخطط قمیض پر سونے کے چوکھونٹے بٹنوں اور گہرا گہرے بیس والی زمردیں کمری پہنی ہوئی تھی۔ اس کے گھنگھریالے بالوں پہ بیک نگار زرجوزی دوپٹہ تھا۔

کیا یہ وہی نواب زادی تھی جس نے اس سخت ٹھنڈی رات کو مجھ سے کہا تھا :۔

"جی ! تو کیا ایک نواب زادی ہوٹل والے سے بیاہ کرے۔ تم نے اپنی بہن سے نوکری کرا رکھی ہے"۔ کیا اس نے واقعی مالک ہوٹل یمانی سے

بیاہ کر لیا تھا۔ بیاہ کر لیتی تو کچھ عیب نہ تھا۔ وہ تو جی٘ کی داشتہ تھی مجھے ایک بیرے نے ایسا ہی بتایا تھا۔ اس نے بھی کیسی دہیج پلٹ لی تھی۔

میں تقریباً تمام ہی وقت اسے کنا چھ سے دیکھتا رہا تھا۔ اور پھر بل کی ادائیگی کے لیئے خود ہی سونے کے نئے زیور کی طرح چمکتی دمکتی کاؤنٹر پہ گیا، تاکہ اسے نزدیک سے دیکھ سکوں، وہ وہی تھی جس کا بدن اس ہاتھی دانت سے بھی اوّل تھا، جو کبھی آئی وری کوسٹ کے تاجروں نے بہترین سمجھ کر دساور کو بھیجا ہوگا۔ مجھے اب بھی وہ ایسی ہی اڑاک دم باز کبوتری معلوم ہوتی۔ جیسے صبح کو اڑائیں تو شام کو اترے اور سردیوں کی ٹھنڈی دوپہری میں دور آسمان پر کالے بادل تلے سفید تارا سا چمکے۔ اس کے جسم پہ ایک رتی بھر گوشت زیادہ نہ تھا اور نہ کم تھا۔ میرا دل چاہا کہ اسے فوراً ہی منتھیا کر اپنے باغ لبِ دریا کے تی منزلہ پہ لے جاؤں، جہاں وہ برساتی تھی جس پر قوسِ قزح رنگ کا نائی دار لہریا ٹین پڑا ہوا تھا۔ وہیں میں نے پھول سروں کے چار جوڑے شوقیہ پالے ہوئے تھے۔ یہاں کھڑے ہو کر ہم دونوں دہاولوں سے ہریائے ہوئے ربیع کے کھیت دیکھتے جن میں دیہاتی مویشیوں کے ریئے ہرا چاٹتے پھرتے ہوئے ہوتے۔

اس نے میری طرف ذرا بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا تو میں سمجھا یہ دل چوری نہیں، اتفاقیہ امر ہے لیکن جب ہفتہ سے زیادہ گزرا اور اس نے میری طرف آنکھ ہی نہ اٹھائی، تو میں سٹپٹا ہی تو گیا۔ ایک شب...... جب کافی چھیڑ ہو گئی تھی میں نے کاؤنٹر پہ جا کر اس سے پوچھا۔ "اب کے

لوہڑی کہاں منائیے گا؟"

"ہم ہندو نہیں۔"

"اس رات گوردوارے میں کیسی مسحور کن موسیقی ہو رہی تھی، راج کرے گا خالصہ۔"

"ہم سکھ نہیں۔"

"میں جانتا ہوں آپ ہندو ہیں نہ سکھ۔ جو ہیں، ہیں۔ میں تو آپ کو کچھ یاد دلانا چاہتا تھا۔

ہمیں کچھ یاد نہیں آتا۔

جب آپ فیاضی دکھانے کے لیے چور کھڑکی سے آئی تھیں، سنجاف لگی چادر میں پہاڑی کستوروں کے پروں ایسا جھالردار جانگیہ اور شمیز پہنے ہوتے۔"

"وہ کوئی فاختہ ہوگی، جو اڑ چکی، ہم نہیں تھے جی!"

"اور وہ الائچی دانے!"

"آپ چاہتے ہیں نا تو ہم کاؤنٹر پر نہ ٹھہریں یا آپ ایسوں کا داخلہ اس ریستوران میں بند کر دیا جائے۔ ایسی بے وزنی باتیں نہ کیجیے۔"

"جاں ستانم، دل ستانم۔"

"کیا ٹیں ٹیں مچا رکھی ہے، خاموش!"

"ایسی ثقیل زباں نہیں بولا کرتے۔ اور ہم سے القط نہ کیجیے۔"

آپ اپنی مسرت نہ گنوائیں۔ نہ ٹھنٹھنائیں، جائیں۔"

"آپ بڑی چھچھوری اور سر زور ہیں۔"
"اڑیل نہ بنیں۔ جائیں، جائیں۔"
"اس طرح نہیں پھٹکارا کرتے۔"
اس کی آنکھیں نیلی پیلی ہو رہی تھیں۔ اس کے متمرد و متکبر چہرے کا پھولاؤ ظاہر کر رہا تھا کہ اسے میرا ذرا بھی پاس خاطر نہیں۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں زور سے پھٹپھٹائیں، بند کیں اور کھول دیں۔ وہ گویا مجھ سے برسرِ پیکار ہونا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تو گویا اگیا بیتال کی آنکھوں جیسے چراغ جلنے لگے تھے۔
جب میں باغ لبِ دریا پہنچا اور لباسِ شب پہن کر لیٹنے ہی والا تھا کہ محبوب نے خبر دی۔ "کوئی لڑکی آپ سے ملنے آئی ہے، ڈرائینگ روم کے برآمدہ میں کھڑی ہے۔"
"تم نے نام پوچھا؟ .... کون ہے؟"
"وہی جو پہاڑ پر چوبر کھڑکی سے آئی تھی۔"
میرا جی من سے ہو گیا کیونکہ میں نے خیال کیا کہ یہ مغنی ہوگی جسے پھر ویسا ہی انبساط ہوا۔ وہ جو رستوران میں سخت رو اور برسرِ پیکار سی نظر آتی تھی وہ محض ھیکڑی دکھاتا تھا۔ پہاڑ پہ بھی جوڑ ہٹانے اور موزوں ہونے کے لئے آئی تھی۔ سو یہاں بھی آ گئی، اس کی درست نیتی میں کوئی شک نہیں۔ میں نے محبوب سے کہا کہ اس کے لئے ڈرائینگ روم کھول دے تاکہ اتنے میں کپڑے پہن کر تیار ہو سکوں، پھر سوچا کہ

کہ اس تکلیف کی بھی کیا ضرورت ہے تو وہ یہیں آجائے گی۔ پھر میں نے اپنی خواب گاہ میں بجائے مغنی کے اسی گندمی سانولی لڑکی کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ آتے ہی بولی: "آج بھی ناخواندہ مہمان کو کھڑا رکھ کر اس کی تواضع کھری کھری باتوں سے کیجئے گا۔"

"کہیے تو آپ کے لئے اپنی آنکھیں بچھا دوں۔"

"آپ نے میرے بشرے سے قیافہ شناسی کر لی ہے۔ دیکھئے کہیں گرما گرم خبر سے تلملا نہ جائیے گا طبیعت ہلوریاں مار رہی ہو گی۔ وہ موٹر لئے پل پر کھڑی ہے، آپ کے انتظار میں.... آپ کو منانے کے لئے آئی ہے۔ اخلاص مندی کے نظارے کبھی نہ دیکھے ہوں تو آج دیکھ لیجئے گا۔ یہ کمرہ کافی بڑا ہے نیچے پھول دار جاپانی قالین بچھا ہوا ہے۔ وہ اسی میں اپنا "ٹریفک کے سپاہی والا ناچ دکھائے گی۔ وہ تلوار کا ناچ بھی جانتی ہے۔ ڈول سے پانی بھرنے کا ناچ بھی۔ وہ بہت اچھی رقاصہ ہے۔ لیکن ٹریفک کے سپاہی والے ناچ سے وہ ایسے تیر بے طرح مارتی ہے کہ دیکھنے والے بے کل ہو جاتے ہیں۔"

میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے، دل چاہ رہا تھا کہ بھاگا بھاگ اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ ہم کھلی چاندنی میں ان داؤدیوں کے پاس سے گزرے جو روش کے دونوں طرف ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے جاپان کے جھنڈے میں سورج۔ جب ہم پل پر پہنچے تو مغنی نے جو موٹر کی پچھلی گدی پر بیٹھی ہوئی تھی، کھڑکی کھول دی۔ گندمی رنگ لڑکی اندر گئی ہی تھی کہ موٹر چل پڑی۔ میں

اسے اچھی طرح سے دیکھ بھی نہ سکا تھا۔ ٹوٹتے ہوئے جب میں گل شبّو کے پاس سے گذرتا ہوا دالانوں میں پہنچا تو میں نے وہ تین گملے ٹھوکر مار کر توڑ دیئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے کبھی بھی نہ گلاب لگا اور وہ یہاں اس طرح لائی جائے تو عجب بات ہے۔ جس طرح میرے دوست عبدالملک کے گاؤں میں چٹیئے چمار گھنیٹا چڑھانے کے لئے سؤر کو لاتے تھے۔ اس کی چاروں ٹانگیں مضبوط جیوڑی سے جکڑی ہوئی ہوتی تھیں۔ وہ بلی میں سر کے بل لٹکا ہوا ہوتا، جسے یہی چمار کندھوں پر اٹھائے ہوتے تھے۔ عبدالملک کے باپ کا اس گاؤں میں وہ زور تھا کہ کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ سؤر کو پاؤں پاؤں چلاتا ہوا لا سکے۔

اگلے دن میں شہر کی سب سے بارونق شاہراہ سے گزر رہا تھا جب میری کار رجمنٹ چوک کو عبور کرنے لگی، تو سامنے سے میری طرف آتے ہوئے مغنی نے ایسی چیخ سی ماری جیسے وہ حادثہ کا شکار ہوتی جا رہی ہو۔ میں نے رک کر کہا "خیریت تو ہے" وہ منہ سکوڑا کر یہ کہتے ہوئے بڑھتی چلی گئی۔ "آپ بڑے بے تکے ڈرائیور ہیں۔ آپ کا چالان ہونا چاہیئے۔ اور بھاری جرمانہ۔"

میں نے اسے کلائی سے پکڑ کر کھڑا تے ہوئے جواب دیا۔ "جو آپ جھوٹی گواہی دیں گے تو ضرور میرا چالان ہو جائے گا۔"

"نہیں جی۔"

"تو پھر کچھ نہ ہو گا۔"

"وہ جو کچھ میں نے آپ سے کاؤنٹر پر دو دو نوکیں کی تھیں اور ذرا دل کا غبار نکالا تھا اس سے ناراض ہیں آپ ؟"

"اس سے مجھے یہ پتہ چلا کہ آپ اندرائین کا پھل ہیں دیکھنے میں خوب مگر بدذائقہ .... باہر سے بھبھی... اندر سے ظالم ۔"

"خوش ذائقہ اور تعریف والا، آپ بڑے طماع، حریص ، اور اوچھنگ باز ہیں ۔"

"ثبوت ۔"

اس رات جب ہم آپ کے پاس آئے تو آپ کی عملہ گی دیکھ لی تھی ۔ آپ ہمیں فرو کرنا چاہتے تھے ۔ بلکہ آپ ہمارے مقابلہ پر تیار تھے، ہمیں بات کی بات میں ھپ ہی تو کر لیا جاتا ۔ لیکن آپ بڑے ریائی ، بڑے تھڑدے، نارو اور بدسرشت نکلے تھے ۔ جو آپ کو ہماری ہونس ہوتی تو ہمیں آپ اپنے حال پر چھوڑ کر یوں دم دبا کے سر پہ پاؤں رکھ کر نہ بھاگتے ۔ .... اور اتنے عرصہ کی فراموش کاری کے کیا معنی ہیں ؟ تو پھر اس صورت میں ہم نے مسٹر جی سے بنائی تو کوئی الاہنا تو نہیں دے سکتا ۔ البتہ ہم فی الواقعہ آپ کو دہ کھ سکتے ہیں ۔ آپ کا دفتر پہاڑ پہ ہی رکھا رہ گیا تھا ۔ جب ہم اس کے ہمیرے سے نہ بناتے تو وہی جب ہمارے بعد آپ کے پاس آئی تھی کہتی تھی کہ ہنڈا پھوڑ کر ہمیں سر بازار رسوا کرائے گی ۔ ہمیں آپ کی شتر دلی ، سبک مزاجی ، ہلکائی ، اور ہیٹے پن پہ اتنا غصہ آیا تھا کہ آپ کو کوہ آتش فشاں پہ بٹھا دیتے ، جس سے آپ کا سلفہ ہی تو ہو جاتا ۔

اسی برتے پر آپ تجدید ملاقات کے خواہاں ہیں۔ ہم نے آپ کو اپنا دل نکال کر دیا تھا۔ جس کی آپ نے یہ قدردانی کی تھی کر اسے گھور کر پھینک مارا تھا۔ جب ہم آپ کے قابل تھے، آپ ہمارے قابل تھے۔ اب نہ ہم آپ کے قابل ہیں، نہ آپ ہمارے قابل۔"

اس وقت میرا دل یوں چاہا کہ اسے فوراً ڈگمگا جاؤں لیکن وہ رو رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کیوں؟" اس نے ایک سسکی بھرتے ...... ہوئے جواب دیا۔ "کلائی میں درد ہو رہا ہے، چوڑیاں چبھ گئیں۔ اور کچھ کالی چوڑیوں کے سرے سڑک پر پڑے تھے۔ پھر وہ کہنے لگی۔"

وہ گھڑسوار جو اس شب ہمارے نیزہ سا مارتا پھرتا تھا، حتیٰ تھا۔ اسے ہم پر مسلط کرنے والی وہی گیہواں رنگ گھاتن تھی۔"

رات کو میں پھر ہوٹل یمانی کے رستوران میں گیا۔ کاؤنٹر مغنی سے خالی تھا۔ میں نے بیرے سے دریافت کیا تو اس نے کہا "مالک آیا ہوا ہے، آج وہ اس کے پاس ہے۔ جو ہوٹل یا رستوران حتیٰ صاحب کھولتے ہیں یہ لڑکی وہاں ضرور بھیجی جاتی ہے۔ اور جب کام چل نکلتا ہے تو اسے مالک اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ حتیٰ صاحب کے جتنے ہوٹل ہیں باری باری ان سب میں ہی کبھی نہ کبھی یہ اس طور سے جاتی رہتی ہے۔ حتیٰ صاحب کے بہت ہی اعتبار اور پیار کی چیز ہے۔ لیکن ان سے شادی نہیں کرتی۔ اس کے باپ نے بھی اس کی ماں سے نکاح

نہیں پڑھایا تھا۔ مغنی کی متنیٰ نواب کی محل اسے لونڈی کی طرح سے رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن باپ نے اسے خوب لکھا پڑھا دیا۔ اس کے کارن بیگم صاحبہ مالک سے لڑ کر میکے چلی گئی ہیں ۔۔۔

"پوچھ سکتا ہوں ۔" ان کے ماں باپ کون ہیں ؟"

"باپ نواب تھا، عرصہ ہوا مر گیا ۔ ماں لونڈی تھی جسے بچے اٹھانے والے فقیروں نے نواب کے باپ کے ہاتھ لا کر بیچ دی تھی۔

جب میں رستوراں سے باہر نکلنے لگا تو دروازہ کے شمال میں سیڑھیاں اوپر جاتی تھی جہاں لکھا تھا، "پرائیویٹ رہائش مالک ۔" اس طرف سے مجھے چھن چھن، گن گن کی آواز آئی، تو میں اوپر چڑھا سامنے طرب گاہ کا دروازہ بند تھا ۔ میرے پیچھے پیچھے چائے آ رہی تھی جسے وہی بیرا لا رہا تھا جسے میں نے کافی بخشش دے کر باتیں پوچھی تھیں ۔ میں نے اس سے کہا "اندر کیا ہو رہا ہے" "کون ناچ رہی ہے؟" کاؤنٹر والی ! تھوڑی دیر کے لئے دروازہ اس طرح سے کھول جانا کہ ہم بھی جلسہ دیکھ سکیں ...

..... یہ اور بخشش لیتے جاؤ ۔"

مغنی ٹریفک کے سپاہی والے ناچ میں مشغول تھی ۔ ہٹلر ایسی مونچھوں والا حبشی سماجی کی طرح صوفے پر بیٹھا تھا ۔ مجھے اس کے رقص سے کوئی خوشی نہ ہوئی ۔ وہ مجھے ڈھینگا سی معلوم ہوتی تھی ۔ اس نے وہی پہاڑ والی ریشمی شمیز اور نیکر نما جانگیہ پہنا ہوا تھا ۔ بدن کا ہاتھی دانت اب بھی کھرا تھا۔ لیکن وہ جلیل القدر نہیں معلوم ہو رہی تھی ۔ مجھے ایسا غصہ آ رہا تھا جیسے دوڑ کر اس کے ترسوانچے چھوڑ دوں گا ۔ اور ہاتھ پاؤں پر سروہی سے چو رنگ چلاؤں گا

ٹریفک کے سپاہی کا ناچ ختم کر کے اس نے جپسی ناچ شروع کیا۔ جپسی ساجی کی طرح سہہ سرخ دف بجاتا ہوا انگریزی کا یہ فلمی گیت گا رہا تھا:۔

"Dance, Little GYPSY
And so weave your spell.

خانہ بدوش لڑکی تو ناچ، ناچ، ناچ
جادو کے تانے باتے تو خوب بنتی پھر"

جب میں یمانی سے سڑک پر آیا تو عنابی ساڑھی پر بنفشئی اوور کوٹ پہنے ہوئے وہی گندمی سی لڑکی مل گئی، وہ میرے ہی پرائیویٹ کمرہ میں دو مرتبہ رات کو غیر وقت آ چکی تھی جس سے کچھ تکلف کم ہو گیا تھا... اس سے میں نے کہا "گمان غالب یہ ہے کہ جب میں نے پوچھا تو آپ اپنا نام مخفی نہ رکھ سکیں گی" اس نے اپنے ہونٹوں پہ تبسم کی ہلکی کرن کے ساتھ جواب دیا "ہمرا"

"آپ میرے ساتھ کہاں چل سکتی ہیں؟"

"جہاں آپ لے جانا چاہئیں۔" کیا اس دوشیزگی اور خنیلی سے کھٹا پن ہو گئی، جس کے لئے ورہم برہم ہوئے پھرتے تھے۔"

"باندی بچہ! حسن کی سرچڑھی داشتہ۔ عیار... مکار!"

"جس کی ردائے عصمت پہ ایسے کھرونٹے آئے ہوئے ہیں کہ کئی جگہ سے پھٹ بھی گئی ہے؟"

"کئی جگہ سے نہیں پھٹی، جگہ جگہ سے پھٹ گئی ہے۔"

"آپ، اس ردائے عصمت کو مزید پھاڑنا چاہتے تھے۔ اور بند خرم کھلتے تو اس کے آگے سے کالداغی گر پڑتی اور لٹک لٹک کر ڈلکتا جھکولے کھاتا ہوا شباب دکھائی دے جاتا۔ اس کا گویا تو کبھی اور کے کام آیا۔ وہ آپ کو چھلین دینا چاہتی تھی۔ لیکن آپ اسے ہی بے غل و غش قبول کرنے کو تیار معلوم ہوتے تھے۔ اس نے تو اپنے اوپر اتنا بڑا فضیلت کا پگڑ بندھوایا ہوا تھا کہ ناک اور دہانہ تک ڈھک گئے تھے۔"

"اس رات وہ گھڑسوار آپ نے ہی بھیجا تھا۔۔۔ کیوں؟"

"میں نے نہیں بھیجا تھا۔ میرے جنون رقابت نے بھیجا تھا۔ کیونکہ پہلے تو وہ آپ کی شمشیر زنی کے کرتب دیکھنے کے لئے آپ کے پاس پہنچی۔ تو اس کا تو میں نے کھنڈن کر دیا تھا۔ لیکن اسے ڈنگ کھانے اور ٹیسیں لگوانے کی اتنی پڑی ہوئی تھی کہ اس نے باہر نکل کر آپ کا پیچھا کیا اور حتمی صاحب جو اس کے لئے اپنے دل و جگر دونوں ہاتھوں پر لئے پھرتے تھے میں نے انہیں جا بتایا۔"

"جو میں اگلے دن ٹھہرا رہتا تو کیا ہوتا؟"

"یعنی کہ میتبر سے اور کسی دن دوپہر میں آپ کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو خان صحابہ پہ باروں نے برطانوی سپاہیوں سے کیا تھا۔"

میرے دل کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے کوئی اس پر ریگ مال چلا رہا ہو۔ کچھ تسلی سی محسوس ہوتی تھی تو صرف اس سے کہ میرا

کاریں ارادتاً مجھ سے مل بیٹھی تھی - میں مغنی کے سر نشان کو اپنی یاد سے
اس طرح ختم کرنا چاہتا تھا، جس طرح "بندہ بہادر" کے نشانات
پنجاب کے گورنر نے ختم کئے تھے - اُس کی تلی تک قتل گاہ سرہند میں
اس کے سامنے ہی مار ڈالی گئی تھی - میں مشرق کی طرف شہر سے باہر
ویرانے میں نکل گیا، جہاں سڑک کے دو طرف ریت کے چھوٹے چھوٹے
ٹیلے سے تھے - ان پر کہیں کہیں کلی خاردار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور کوئی
کوئی گیدڑ سڑک کی طرف منہ اٹھائے ہوئے اس طرح بول رہا تھا جیسے
کسی گاؤں کے پژمردہ کتے ژولیدہ حال پاہن کو دیکھ کر بھونکیں۔ کسی کسی
جگہ کوئی اگیا بیتال بھر رہا تھا - جس کے منہ میں بڑی لو کے چراغ جل رہے
تھے - شمال میں سڑک کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک دریا برآمد اراضی
میں کھاد کے لئے بوئی ہوئی سنی کی طرح سے بھانگ کھڑی ہوئی تھی - دریا
کا ریت چاندنی میں چمک رہا تھا اور پانی کی ایک ہنگی سی سیاہ لکیر کھینچی ہوئی
تھی - اسی دریا کے کنارے سے تند آدم ولائتی دھتورا ابھی کھلا ہوا تھا - اور
تند فیل بینڈ پولوں پر لمبے لمبے بھورے بھورے ڈھول ایسے پھول آئے
ہوئے تھے - جب ہم تیس میل دور چھانگا چھینے پنگاؤں کے نزدیک پہنچے
تو مجھے یوں معلوم ہونے لگا جیسے ان پر رائفل والے دشمن چھپائے ہوئے
ہیں - اور جو ہم ادھر گئے تو ضرور گولیوں کی بوچھاڑ ہو جائے گی جھانکتے ہیں
لکڑ بھگے چلا رہے تھے - میرے دل میں اس وقت ایسی ڈر بل بیٹھی کہ
یہیں سے شہر لوٹ پڑا - مغرب سے دل بادل بھی چلا آ رہا تھا -

جب میں اور سمرا پل پر آئے تو کار کی چھت دھواں دار گھنا کی بوندوں میں پٹاپٹ بول رہی تھی لیکن جب ہم گیراج سے اتر کر خواب گاہ کی طرف جانے لگے تو ایسی بھوار پڑنے لگی کہ کپڑے تو نہ بھیگیں لیکن سیل ضرور چڑھ جائے۔ خواب گاہ میں پہنچ کر میں نے لباس شب خوابی پہن لیا اور سمرا کو بھی ایسے ہی گلناری بینگنی دھاریوں والے کپڑے پہنا دیئے جو اس پر خوب سنگر گئے۔ آج شام سے نہ سمرا نے کچھ کھایا تھا نہ میں نے۔ اس نے مجھے اپنی طرف سے بیٹھ کر کے لٹایا اور وہ میری پشت سے بچی ہو کر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی: "مسٹر..... خالی پیٹ نہیں سویا کرتے" اس وقت خانساماں سو چکا تھا۔ سمرا میرے ساتھ باورچی خانہ گئی۔ اس نے برقی اسٹو پر انڈوں کا زعفرانی خاگینہ، ہلکے میٹھے پراٹھے اور چائے تیار کر لی۔ بانسی کے پرانے چاول پہلے سے پکے ہوئے تھے، ان پر ڈھیر سی سیوا ری جما کر گھی کھوپرا کشمش بادام ڈالے۔

جب ہم دانت صاف کر کے بستر میں لیٹے تو میرے تردوات کافی دور ہو چکے تھے۔ میں نے اسے اس طرح سے ترچھایا کہ اس کی ٹانگیں پٹی سے نیچے لٹک گئیں پہلے تو میں نے اس کے کندھے پکڑ کر ٹھونگتا رہا لیکن جب اس کے سنسناتے ہونٹ تما میرے اختیار میں تھے اور میں شاید اچھوبی ہو جاتا تو دروازہ پر سہمناک دستک ہوئی۔ ملازم ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ساتھ ہی بادل گرجنے لگا۔ یہ گھور ایسی بھیانک معلوم

ہو رہی تھی جیسے کوئی مردم خور دیو نحیف و نزار انسانوں کو ہنہ ہنہ کر کے ہانک رہا ہو۔ میرا منہ کا منہ میں ہاتھ کا ہاتھ میں رہ گیا۔ سمر اپنے کپڑے پہن لئے۔ اور وہ پچھلی کھڑکی سے اس پیڑ کی طرف اتر گئی، جس کا تنا اور پتے راجپوت، مدرسۂ مصوری کے درختوں ایسے گنجان تھے۔ اس کی شاخوں پر میں گچھے دار، تاج دار، دراز دم، رنگ دار پرند بیٹھا کر دیکھا کرتا تھا۔ اس پہ برسات میں رنگ برنگ پھولوں کی بیلیں بھی چڑھا کرتی تھیں۔

دروازہ کھلتے ہی ہٹلر ایسی مونچھوں والا جٹی اندر داخل ہوا اور واقعی جیسے میرے دوست عبدالمالک کے گاؤں میں جھنیے چمار گھسیٹا چڑھانے کے لئے سور کو بانہی میں ٹانگوں کے بل لٹکاتے ہوئے لایا کرتے تھے کہ اس نجس جانور کے پیر گاؤں کی زمین پہ نہ پڑیں یعنی اسی طرح سے یہاں لائی گئی تھی۔ جٹی نے باندی باندں کی طرح بولتے ہوئے کہا "سمر دی خوب ہو رہی ہے، میں آپ کو گرم رکھنے کے لئے ایک چیز لے آیا ہوں۔ ٹریفک کے سپاہی والے ناچ کے بعد جو آپ نے بھی دیکھا تھا راز دار بیرے نے ان کا یہ آپ کے نام محبت نامہ آپ تک پہنچانے کی بجائے مجھے پہنچا دیا ہے۔ اس میں انہوں نے آپ سے اپنے ناز بے جا کی معافی مانگی ہے۔ پرسوں یہ آپ کے پاس آتے آتے پل پر سے لوٹ گئیں تھیں اور انہیں گوردوارہ کا فوجی گانا بھی یاد آ رہا تھا۔ جب یہ جامنی تالین والے کمرے میں آپ کے پاس لوہڑی کے تہوار والی رات کو گئی تھیں۔ کسی کی ابتداء عشق کسی طرح ہوتی ہے کسی کی کسی طرح۔ آپ کی الائچی والوں سے ہوئی تھی۔

میں اپنی بیاہتا کو طلاق دے چکا۔ اگلے ہفتہ یہ چوہر محل میری منکوحہ بننے والی تھیں، ان کے پاس روپیہ کی کمی نہیں گو نواب صاحب اپنی زندگی میں اپنی کل جائیداد اپنی اجنب اولاد کے نام منتقل کر گئے تھے۔ ان کی کنیز ماں کو نواب صاحب کے مرنے پر تیس ہزار ملا تھا۔ وہ مع اس رقم کے سیاہ بنس بھوڑ کے ساتھ بھاگ گئی تھیں۔ کنیز کی بٹو نی کے نام ہی نے تیس ہزار روپے بینک میں جمع کر دیئے ہیں۔

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

لیکن آپ کے ساتھ یہ خوب نبھائے گی۔ آپ سے انہیں عشق ہے۔ ہم سے تو اب تک انگلیچر الٹ پلٹ ناطہ تھا پتہ نہیں جب ان کے پاس ایک مارتول تھا، تو پھر دوسرے مارتول کی ضرورت کیوں پڑی ؟ دیکھیئے انہوں نے خط میں آپ کو القاب کیا لکھا ہے "غفران پناہ !"

حسی چکّی سی بھبو کر چلا گیا، کنیز کی بٹو نی مغنی نے ٹریفک کے سپاہی والا ناچ شروع کر دیا۔ وہ خوشی میں گا رہی تھی۔

"Dance Little gypsy
And so Weave your spell"

میں نے اس سے کہا "چپ چپ۔ سب جاگ جائیں گے جھگڑ مچ جائے گا۔" وہ چپ تو ہوئی لیکن ناچ بند نہ کیا، کچھ دیر بعد قالین پر

بیٹھ کر پوچھنے لگی۔ "آپ میرا جانا چاہتے ہیں تو میں ابھی چلی جاؤں؟"

"جس کی کسی کے دل میں اتنی چٹپٹاہٹ ہو، وہ اسے جانے نہیں دیا کرتا۔"

"تو پھر میں بھی آپ کی حلقہ بگوشی اختیار کر چکی۔"

"مجھے تم سے اپنی چاک جگری کی رفوگری کرانی ہے۔ تم چلی گئیں تو اس کا قرحہ بن جائے گا۔"

اس پر وہ ان چار چشموں کی طرح کھلکھلا اٹھی جو "دل عاشقاں" پر چھایا کرتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں نشہ آگیا تھا، اور چہرہ کی جگمگاہٹ بڑھ گئی تھی۔ پھر وہ مجھ پر جی جان سے قربان ہوتے ہوئے بولی: "مجھ پہ تو آپ صاحب جی کریں۔ میں تو ہمیشہ آپ کی حاضری میں کھڑی رہا کروں گی۔ منٹی کی ماں کو بچے اٹھانے والے فقیروں نے نواب کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ منٹی آپ کی بے درہم لونڈی بنی رہے گی، نہیں بلکہ عبادتی۔"

پھر میں اس کی صحیح البدنی کو دیکھنے لگا۔ "دل عاشقاں" والی ٹنک پر کھڑے ہوئے دیودار اس سے زیادہ طراوت بخش اور سیدھے سڈول نہ ہوں گے۔ اس کا بشرہ نہایت ہی مخلصانہ اور سلیس تھا۔ وہ ستودہ صفات اور سلیم الطبع معلوم ہو رہی تھی۔ اس وقت آسمان پر ساون کے مہینہ ایسی ہبڑ دبڑ مچ رہی تھی۔ جب گولا دھار برسنے لگا تو سمرا کھڑکی کھول کر اندر آگئی جو الائچی دانے والی کو مظفر و منصور دیکھ کر روپوش اور سونٹھ ماری سی ہو رہی تھی۔ اس کے کپڑے بالکل شرابور ہو چکے تھے۔ میں اس

کے لئے سرخ و سپید دھاریوں والا اپنا لباسِ شب خوابی لایا تو مغنی میری طرف مفسدانہ سی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو "اور مجھے بھی تو۔" اسے میں نے سیاہ سپید دھاریوں والے کپڑے پہنا دیئے۔ اب یہ دونوں لڑکیاں برابر کی منکسر تو نہ تھیں لیکن چندے آفتاب چندے ماہتاب، یا شوالے کے چھوٹے بڑے گنبد ضرور تھیں۔ اور دل چاہتا تھا کہ ان دونوں کے ہی لب و رخسار کو بوسوں سے چھیپ دوں۔ میں نے مغنی اور سمرا کو اپنی خواب گاہ میں ایک بستر سونے کے لئے دیا۔ میری چارپائی بھی ان کے پاس تھی۔ ہم تینوں ساری رات جاگتے رہے۔ دھوپ دانی میں خوشبوئیں جلتی رہیں اور باہمی ارتباط صرف لطیفہ گوئی تک محدود رہا۔ مغنی اپنا چہرہ اور کروٹ میری طرف کئے ہوئے لیٹی تھی۔ سمرا کو اس نے اپنے پیچھے لٹا رکھا تھا۔ ایک مرتبہ جب ہنسی ہنسی میں سمرا مغنی سے پچھر ہو گئی، تو میرا دل بھی للچا اٹھا اور طبیعت چاہنے لگی کہ میں اپنا سینہ اس کے سینے پہ ٹیپ دوں۔ ہم تمام رات منہ ایک دوسرے کی طرف کئے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے۔ صبح ہونے سے گھنٹہ بھر قبل جب پھوئیاں برسنے لگا اور سمرا جھپکی لینے لگی تو مغنی نے کہا: "میں نے آپ سے ناامید ہو کر حئی سے تعلقات بڑھائے تھے۔ لیکن میں آپ ہی کی طرح سے اچھوتی اور ان چھپڑ ہوں، مجھ پر کوئی حاوی نہیں ہو سکا۔ میں ہر کسی کی دست برد سے بچی ہوئی ہوں، اور اچھوتی! وہ جو الائچی دانے میں ایک کالا کالا چھوٹا سا بیج ہوا کرتا ہے وہ مجھ میں آپ

کے لئے اب تک موجود ہے ۔

"آپ ہیں تو وہ الائچی دانے کے اندر سا لیسا کالا کالا چھوٹا سا بیج فی الواقعہ صحیح و سالم موجود ہے لیکن میں کیا کروں، میرا دفتر تو پہاڑ پر ہی رکھا رہ گیا تھا ۔"

یہ فقرہ سن کر اس کی سوئی کی نوک ایسی باریک باریک باچھیں تھوڑی سی کھنچیں اور برابر ہو گئیں ۔ اسے اپنا وہ فقرا یاد آ گیا ہو گا "البتہ ہم فی الواقعہ آپ کو دو دکھ سکتے ہیں ۔ آپ کا دفتر پہاڑ پر رکھا رہ گیا تھا" اور میں سوچنے لگا کہ خلیفہ مامون کی ماں بھی تو کنیز تھی اور مینے لاؤس ہیلین کو یونان واپس لے گیا تھا ۔ گو اس نے پیرس کے ساتھ اتنے سال گزارے تھے یعنی کو مجھ سے چسپیدگی ہے مجھے منفی ہے ۔ ہم دونوں کا دور دور رہنا ایسا ہے جیسے لیئے خوش آ رہی ہو اور کوئی ناک بند کرے ۔

(سویرا لاہور)

ادھ کھایا امرود

۱

کوئی دوسرے کے ادھ کھائے امرود کو کیوں کھانے لگا۔ جب لنکا کا کوٹ ایک مرتبہ سر ہو چکا، اس کے جدید پھاٹک کھل ٹوٹ چکے، تو اس پر یورشیں کرنے میں کیا تک تھی، اور حسن جہاں افروز میلو کو اس کمتری کا احساس تھا۔ سو یہی وجہ تو تھی کہ ہم حدیقہ والی کوٹھی کے شرقی برآمدے کی طرف شام کی چائے پر بیٹھے تو وہ کہ جس کی نظریں کبھی نچلی نہ ہوا کرتی تھیں۔ جب وہ سامنے بیٹھی ہوا کرتی تو ایسا محسوس ہوا کرتا تھا جیسے اس کی آنکھیں جھلمل جھلمل کھلونے ہوں۔ اس کی آنکھیں گویا اڑتی تتلی کے پروں کی طرح رنگ پر رنگ پیش کرتی رہتی تھیں، لیکن آج اس کی آنکھوں میں نچلاپن تھا۔ اور حزیں سنجیدگی۔ ایک مرتبہ چائے پیتے ہوئے میرے منہ سے ذرا سپر سپر کی آواز نکل گئی تو وہ مجھے جھپکانے کے لئے ذرا زور سے سپر سپر کر کے چائے پینے لگا۔۔ لیکن وہ تو ایسی خاموش رہی، جیسے مائیوں بیٹھی ہو...... وہ اخبار نویس اور پارلیمانی سیکرٹری سے بھی زیادہ حاضر جواب تھی.... مگر آج تو کھسیانیت سے اس کا منہ سیا ہوا تھا۔

باہر بجلی چمک رہی تھی۔ بادل ایسا گھٹا ہوا تھا جیسے برسنے پر پانی نیزوں چڑھ جائیگا۔ کوٹھی کے جنوبی حصّے میں جو لوکاٹوں کی منگلی تھی۔ اس کے اندھیروں میں بسیرا کرتی ہوئی سانجھ چڑیاں بول رہی تھی۔ شرقی برآمدے کے آگے کھڑے ثمرآور جھمکدار سبند دے آم ہریالے ماحول میں سجل معلوم ہو رہے تھے۔ میلدہ کا چہرہ بھی انہیں آموں ایسا تھا۔ پچھلے سال انہیں دنوں جب تھوڑا سا برسنے کے بعد دکھنا بادلوں کو تتر بتر کر رہی تھی تو انہیں آموں کے درمیان میں نے اس عشوہ گر سے سوال کیا تھا۔

"آپ کو گندھرپ کے معنی آتے ہیں ؟"

"نہیں"

"اس کا مطلب ہے۔ عشقیہ شادی، کیا آپ کو یہ پسند ہے ؟

"...... پہلے پیار اور بعد کو شادی ؟"

"نہیں..... ہونا اس طرح چاہیئے کہ پہلے شادی اور بعد میں پیار۔"

"اچھا میں تو اگر یوں ہو جائے..... پہلے پیار بعد میں شادی اور شادی کے بعد بھی مسلسل پیار۔" ....

.... اصل مقصد وصل ودامی ہو ؟"

"چند سے خاموش رہیئے ہمیں آپ کی باتیں پسند نہیں، ہم آپ کے پاس سے ابھی جایا چاہتے ہیں، پھر یہ اٹرنگ بٹرنگ باتیں فضاؤں کو سناتے رہیئے گا۔"

"مجھے مضطرب چھوڑ کر نہ جایئے...... نہ جایئے !"

" فرائض بتاتے ہیں کہ آپ دماغی توازن کھو چکے سراسیمگی بڑھتی جارہی ہے۔ اس لئے قیام مباح نہیں ۔"

" آپ جیسی شستہ اور کتابی زبان کوئی نہیں بول سکتا ۔"

" ہمیں مرزا غالب نے بھی یہی کہلا کر بھیجا تھا ۔"

" دل چاہتا ہے کہ آپ کی باتیں ہی سُنے جائے ۔"

" لیکن ہمارا آپ کی جانب میلانِ طبیعت ہی نہیں "

" آپ سلام ناز کر کے تشریف لے جا سکتی ہیں ۔"

" ہمیں یہ بھی گوارہ نہیں ۔"

" کچھ گوارہ بھی ہے ۔"

" کچھ بھی نہیں ۔"

" کیوں کیا خطا کیا قصور ! "

" نہ خطا نہ قصور، یہ ہمارا اقتضائے طبیعت ہے ۔"

" جب سے تم منکر ہوئیں ۔ ۔ ۔ دل ڈوبا جارہا ہے ۔"

" دھڑام سے گرنے کی آواز تو ہمیں بھی آئی تھی ۔"

" بدلی کی چھاؤں میں پھوار پڑتی ہوتی اور ہم دونوں تی منزلہ کی بارہ دری میں بیٹھے ساون کے تیزوں چڑھے ندی نالوں کو آپس میں لڑتے دیکھتے ۔"

" آپ کے سفلی احساسات آپ کو مبارک ۔"

" آپ کو برشگالی رات میں جھینگر بولتے ہوئے کیسے لگتے ہیں ۔"

" جیسے بھی لگتے ہیں ، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ ہرزہ سرائی جاری رکھئے، ہم چلے ۔"

مینو میری عزیز تھی، بدر بھی عزیز تھا۔ ان دونوں کی رسم منگنی تو نہ ہوئی لیکن ویسے ہر طور سے معاملہ طے ہو چکا تھا۔ بدر کو مجھ پر اس لئے ترجیح دی گئی کہ اسے فوج میں کمیشن مل گیا تھا جب مجھے انتخابی بورڈ والے اس لئے نہ لیتے تھے کہ مجھ میں کچھ کچھ امرود پنے کا شائبہ تھا۔ صدر بورڈ نے تو یہ تک کہہ دیا تھا کہ اس سے تو پانچ میل کی دوڑ بھی نہ دوڑی جائے گی۔ میرے متعلق ان کا اندازہ قطعی غلط تھا شکار میں بدر نے مجھ سے زیادہ جفاکشی کبھی نہ دکھائی تھی۔ بلندستانی جنگلوں میں میں نے جیٹھ کے روزے رکھتے ہوئے شکار کھیلا تھا۔ اور بدر نے پیاس اتنی محسوس کی تھی کہ اس نے اکثر تیسرے پہر سے پہلے ہی روزے توڑ دیئے تھے۔

یہ ابھی کچھ مہینے کی بات تھی۔ بقر عید کا مہینہ تھا۔ محرم سے لگے چاند میں بدر اور مینو کی شادی ہو جانے والی تھی کہ میں اپنے ایک اور عزیز اور بے تکلف دوست جمالی کے ساتھ کوٹلہ شاہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ جاپانیوں کے جذبہ خودکشی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ باہر گرد اڑانے والا اندھیاو چل رہا تھا۔ فضا ایسی ہو رہی تھی جیسے شیطان اس میں قدیم روما کے زمانے کی رتھیں گھڑ گھڑا چلا رہے ہوں۔ ہم تیسری منزل پر تھے، میری طبیعت اتنی چلبلا رہی تھی۔ جیسے میں کھڑکی کھول کر سر کے بل سڑک کے کھڑنجے پر گر پڑونگا۔ میرے آزار کا کوئی علاج دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھر جمالی نے کہا "میں یونانی، اوڈیسیس اور شیواجی مرہٹہ سے زیادہ چالاک ہوں۔ تمہاری شادی مینو سے کرانی میری ذمہ داری ہے۔ اس کی شادی سیکنڈ لفٹیننٹ بدر سے کبھی نہ ہو

سکے گی، گو وہ ہمارے خاندان سے ہے اور تم نہیں، سیکنڈ لفٹیننٹ بدر کو اس کی ضرورت تم سے زیادہ نہیں ہے - یہ جو اندھیا دھند چل رہا ہے، میں اسے تو نہیں روک سکتا، البتہ یہ شادی ضرور ضرور روک دونگا۔

جمالی نے یہ بہادرانہ الفاظ تو استعمال کر دیئے تھے - اور وہ تھا بھی بڑا ہی سچا اور دلاور انسان لیکن میرے دل ہی اسی وقت سے یہ الجھن پیدا ہو رہی تھی کہ جمالی اپنا قول کیسے پورا کرے گا - مینو کا حاصل کرنا میرے لئے قطب تک پہنچنے سے کم نہ تھا - اب جمالی کے قول نے بھی ایک ایسے ہی قطب کی صورت اختیار کر لی تھی - ان قطبین تک کوئی ذریعہ مجھے نظر تو نہ آتا تھا۔

۲

جمالی کے آباؤ اجداد کبھی ملک کے تاجدار رہ چکے تھے - ان کی جائے رہائش شاہی کوٹلہ میں تھی جس کے جنگی دروازے تھے، اور گھڑ گھس بھی تھی۔ ہمارے بزرگ ان کے سپہ سالار تھے - ہمارا قیام حدیقہ میں تھا... حدیقہ چہار رلیوارں والے باغ کو کہتے ہیں - حسن جہاں افروز مینو کا تعلق شاہی کوٹلہ والوں سے تھا - ان دونوں خاندانوں میں رشتے بیاہ ہو رہے تھے - جمالی کے والد کا تنازع خطاب اور پنشن کے سلسلے میں دوسرے خاندانی دعوے داروں سے چل رہا تھا - اور جب ملک کی آخری بڑی عدالت نے فیصلہ جمالی کے والد کے حق کر دیا تو شاہی کوٹلہ میں ایک زبردست مجلس جشن و سماع برپا

ہو رہی تھی۔ چوٹی کی گائن طوائفیں بلائی گئیں تھیں اور سبزہ زار چوگان میں گنڈیری دار درباری شامیانے نصب تھے۔

بیگمات اور معزز مہمان خواتین نوبت خانے کے بلند پھاٹک میں بیٹھی رقص و سرور سے بہرہ ور ہو رہی تھیں۔ سامنے ہانگی کے کپڑے ایسا جھینا جھینا سرخ پردا پڑا ہوا تھا۔ مرغول دار پھاٹک کے پیچھے شمال میں سنگ مرمر کے کھلے فرش پر میز کرسیاں رکھی ہوئی تھیں میزوں پر طرح طرح کے ٹھنڈے مشروبات اور پان سجے ہوئے تھے کہ خواتین جب چاہیں آئیں جب ضرورت شربت وغیرہ نوش جان کریں یا پان کھائیں، الائچی سپاری، اور زردہ چاندی کے نقشین چوگھڑوں میں رکھا تھا جس کسی کو تشنگی محسوس ہوتی یہاں آتی اور جو چیز چاہتی پیتی۔ اس مرمریں صحن کے ہر دو جانب، شرق و غرب، لال پتھر کی مرغول دار دروں والی یک منزلہ عمارت تھی۔ دروں پر زری زر، بیلگنی پردے پڑے تھے، یہاں بستروں کا انتظام تھا اور اندر عود و لوبان دار چینی اور دیگر مشموبات سے خلوت گاہیں معطر تھیں۔ جو کوئی تھک جائے یہاں آ کر آرام کر سکتی تھی۔ اس چوگردہ عمارت کے شمال میں جو سہ دریاں تھیں، وہاں کنیزوں کے آرام کرنے کا بندوبست تھا۔ صحن سے وہ حویلی بھی دکھائی دے رہی تھی جس کے تی منزلہ پر بیٹھے ہوئے جمالی نے کہا تھا۔ "یہ جو اندھیا وچل رہا ہے، میں اسے تو نہیں روک سکتا۔ البتہ یہ شادی ضرور ضرور روک دوں گا۔" میں سبزہ زار چوگان میں نصب درباری شامیانے میں بیٹھا اسی تی منزلہ کی طرف کبھی کبھی نظریں اٹھاتا ہوا

سوچ رہا تھا " کیا جالی اس شادی کو روک سکتی ہے ! جس طرح چلتا ہوا اندھیا رہ نہیں رک سکتا اسی طرح یہ بھی نہیں رک سکتی ۔"

جب رات کی کمر ٹوٹی اور چاند نے مسجد سہ گنبد پر سے کھیت کیا اور مشروبات کی دیکھ بھال کرنے والی کچھ کنیزیں تو شمالی سہ دریوں میں سو گئیں اور کچھ بلند پھاٹک کے بیل پالیوں کے پاس بیٹھ کر گانا سننے لگیں تو حسن جہاں افروز مینو کو پیاس نے ستایا ۔ وہ چمک دار وصلی کا جوتا بلا جراب پاؤں میں پہنے ہوئے صحن میں آئی ۔ اس کے پاؤں گورے پن کی اور چکناہٹ میں سنگ مرمر کو مات کر رہے تھے ۔ اس نے برف میں لگی ہوئی بوتل تیلی سے پی اور کچھ شربت گلاس سے پیا ۔ اس وقت اس کے ذرا بھیگے بھیگے ہونٹ واقعی آب و آتش کی آمیخت کا سماں پیدا کر رہے تھے ۔

وہ واپس جانے ہی والی تھی کہ ایک لمبے تڑنگے مضبوط آدمی نے اسے اس طرح اٹھا لیا جیسے چڑی مار کبوتر کو دلبوچ لے ۔ حملہ آور اسے پردے پڑی ہوئی شرقی استراحت گاہ میں لے آیا ۔ حملہ آور کی گرفت اتنی کڑی تھی کہ وہ مینو کو تڑپنے بھی نہ دے رہا تھا ۔ پھر وہ خوب ہلکاں کی گئی ۔ اس کا جھاڑ کا ازار بند چاقو سے کاٹ ڈالا گیا ۔ سنہری شلوار ایسے ہلکے رنگ کی کہ جیسے عطر ہو ، تار تار ہو چکی تھی ۔ کامدار قمیض کی دھجیاں اڑ گئی تھیں ۔ حملہ آور نے اندر جاتے ہی روشنی گل کر دی تھی ۔

پھر ایک کنیز نے صحن میں شور مچانا شروع کر دیا ۔ ڈاکو ڈاکو ، بیگم مینو

بگیم مینو، دوڑیو، دوڑیو! اس شور پر بلند دروازہ میں بیٹھی تمام مستورات صحن میں ڈھوک آئیں..... اخفائے واردات...... ناممکن تھا۔ حسن جہاں افروز مینو تو گویا چھاپے میں چھپ گئی تھی، اس کے بدنامی کا ٹیکہ لگ چکا تھا۔ مردوں تک خبر پہنچ گئی، بے چاری خستہ اندام، دریدہ ملبوس، حسن جہاں افروز مینو کچھ ہی منٹ میں ایسی بن گئی تھی، جیسے ڈربے کا دروازہ بند ہو گیا ہو، کوئی مرغی باہر بیٹھی رہ جائے، رات کے سناٹے میں باہر بلاؤ پھاڑنے لگے تو وہ چیخ و پکار ہو کہ ہمسایوں کے بچے تک بستروں میں ہڑک کر جاگ پڑیں۔ مینو کے عطر ایسے ہلکے سنہرے رنگ کی شلوار سرخ ہو رہی تھی، چولی کے بٹن اور تکمے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس کا زعفرانی دوپٹہ، رومال، کانوں کا ایک جواہر جڑا آویزہ اور اس کے چہرے کی دغدغا برٹ یہ سب غائب تھے۔ تشہیر اتنی ہو چکی تھی کہ اس سے کوئی کچھ بھی نہ دریافت کرتا تھا۔ اس کے منہ میں بول بھی نہ تھے، امرود ادھ کھایا ہو چکا تھا۔ لنگائے کوٹ کے جید بھاٹک کھل چکے تھے۔ کنیزیں بار بار حاشا رحمان، ماشاءاللہ کہتی پھر رہی تھیں۔

۳

سیکنڈ لفٹیننٹ بدر اور حسن افروز جہاں بیگم مینو کی شادی عشق و محبت کی اساس پر نہ ہوئی تھی۔ جو اس کی بنا عشق و محبت ہوتی تو امکان تو ڑنا مشکل ہوتا اور مینو اس واقعے کی مجرم بھی نہ گردانی جا سکتی تھی۔ جب کوئی راہ

جا رہا ہو۔ لیکن کوئی دوسرا اسے زبردستی پکڑ کر کچھ دیر کو راہ مسدود کر دے تو اسے بے راہ تو نہیں کہہ سکتے۔ پر یہاں تو مسئلہ ہی دوسرا در پیش تھا۔ عورت کی عصمت ایک مرتبہ گئی تو سدا کے لئے گئی۔ ادھ کھائے امرود کا کوئی گاہک نہ تھا۔ گو رشتہ قطع کرنے کی کوئی باقاعدہ اطلاع تو نہیں دی گئی تھی لیکن بدر کی طرف سے یہ رشتہ منسوخ سمجھا گیا تھا۔ جس طرح سے ہٹلر کو کسی ملک پر حملہ کرنے سے پہلے الٹی میٹم کی ضرورت محسوس نہ ہوا کرتی تھی۔ اس طرح بدر کی جانب سے اس ضمن میں کوئی اعلان متوقع نہ تھا۔ اب میرے امتحان کی گھڑی آن پہنچی تھی۔ کیا میرا دعویٰ محبت فرضی تھا؟ کیا میں نے صرف بڑ ماری تھی۔ شاہی کوٹلہ میں بدر یا کوئی اور ادھ کھائے امرود کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ تو کیا ہم اہل حدیقہ بھی انہیں کی پیروی کر رہے تھے؟

حادثے کے اگلے ہی دن مجھ سے ملے بغیر جمالی پہاڑ پر چلا گیا تھا ورنہ اسی سے اپنے دل کی بات کرتا۔

ادھر مینو کو یہ معلوم تھا کہ میں اس کا خواہش ہوں۔ اگر دنیا میں اس کی کسی مرد ذات سے کچھ تھوڑی بہت بے تکلفی تھی، تو صرف مجھ سے تھی۔ میں نے تو خلافِ تہذیب و اخلاق اس سے محبت کا اظہار تک کر دیا تھا۔ رواج کے مطابق ان دونوں خاندانوں میں بیٹی والے کسی صورت بھی بیٹے والوں کو رشتہ کی پیشکش نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اس تھوڑی بے حیا بے تکلفی اور منہ پھٹ پنے کی آڑ لیتے ہوئے جو میری مینو کے ساتھ تھی،

وہ چاہتی تو میرا جذبۂ محبت للکارا تو جا سکتا تھا کہ "کیسے محبت، محبت اب بھی باقی ہے یا اس کا مرنڈا بن چکا۔" اب اس کا امن میرے دل میں تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ میری چھوٹی بہن اور اپنی سہیلی کی معمولی سی علالت کی خبر پا کر عیادت کو پہنچی تھی۔ گوگل پارہ خانم کو صاحب فراش ہوئے دو دن ہو چکے تھے۔ لیکن اسے نزلے کا معمولی بخار اور آدھے سر کا درد ہی تو تھا۔

چنانچہ شام کی چائے پر جب باہر بجلی چمک رہی تھی اور بادل ایسا گھٹا ہوا تھا جیسے اب برسا، اب برسا میں اس ترک طناز کی مدامی خنداں اور تنقیدی نگاہوں میں نچلا پن دیکھ کر یہ بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ آج یہاں کس مقصد کے لئے پہنچی ہے۔ میرے دل کو یہ تسلی ہو رہی تھی کہ وہی شاخ گل جس کے لئے میں کب سے دل پہ ہاتھ دھرے فقیروں کی طرح پلہ پسارے پھر رہا تھا، وہ شاخ گل شجر سے کٹ کر کبھی دوسرے کے پتے میں گرنے کو اس طرح سے لٹک چکی ہے جیسے کسی کا زخمی ہاتھ گلیمنڈے سے کھل کر لٹک گیا ہو۔ آج وہ پلہ جس میں وہ گرا چاہتی تھی، مجھ سے ہٹا لیا گیا تھا۔ اب اسے گرنا تھا یا کر جوتوں کی جگہ زمین پہ یا شجر پہ ہی لٹکے لٹکے سوکھ جانا تھا۔ میرے خیال میں اب وہ اتنی عاجز آچکی تھی کہ اس آس پہ میری طرف جھکے کہ میں اسے گرد آلودگی سے بچانے کے لئے اپنا پلہ پسار دوں گا۔

میں نے اسے پورے ایک سال سے نہ دیکھا تھا۔ ہماری آخری ملاقات حدیقہ ہی کے سینے در ہیئے آموں میں ہوئی تھی جب وہی عشقیہ شادی کا ذکر آیا تھا۔ زیادہ عرصہ گزر جانے کے سبب اب میرے دل میں

اس کی وہ تڑپن باقی نہ رہی - اور میں اسی لئے مذبذب تھا کہ ایک گرے ہوئے موتی کا مول کروں یا نہ کروں پر آج جو میں نے اس کی مضمحل صورت اور نچلی نچلی آنکھیں میز کے دوسری طرف سے دیکھیں تو اوسان بجا نہ رہے - میں سوچنے لگا جو وہ مجھ سے سوال کرے "کہیے اب بھی آپ اسی نظریئے پر قائم ہیں، کہ پہلے پیار اور پھر شادی ؟" تو کیا میں اس کا جواب یہ دونگا " میں اب اس نظریئے پر قائم نہیں ہوں - "نہیں ہیرا، اب تو یہ ہونا چاہیے " بینو مجھے اب بھی تمہاری ویسی ہی آرزو ہے "

۴

تو ہم شام کی چائے حدیقہ والی کوٹھی کے شرقی حصے میں پی رہے تھے جس کے آگے جھمکدار طوطا پری آموں کی زیبائش تھی - گل پارہ خانم کا بستر علالت انتہائی جنوبی کمرے میں تھا - بینو چائے پی کر اسی کے پاس چلی گئی تھی - بڑی جنوبی کھڑکی کے پاس صوفہ اس طرح سے رکھا ہوا تھا کہ وہاں بیٹھ کر باہر دیکھ سکتے تھے - بینو اسی صوفے پر بیٹھی پیلو بجا رہی تھی کیونکہ گل پارہ خانم کے آدھے سر میں درد ہو رہا تھا - اور بینو یہ کہا کرتی تھی کہ وہ ایسا پیلو بجاتی ہے کہ کیسا ہی درد سر ہو آرام ہو جاتا ہے - مریضہ کے درد سر کو آرام ہوا ہو یا نہیں، البتہ بینو نے پیلو بجا کر میزبان کو سلا ضرور دیا تھا - اور تکلیف میں سونا بھی آرام کے مترادف ہے - بینو نے یہ غزل چھیڑی ہوئی تھی ؎

اس کو پا کر بھی اسے پانے کی حسرت چاہیے
وصل میں بھی چاشنیٔ دردِ فرقت چاہیے
گو ہیں ان معصوم آنکھوں میں ہزاروں خوبیاں
کچھ شرارت بھی مگر حسبِ ضرورت چاہیے
اجنبیت جنکی فطرت، بے رخی جن کا شعار
کچھ نہ کچھ ایسوں سے بھی صاحب سلامت چاہیے

لوکاٹوں کے گھنیرے گھنیرے ماحول میں بسیرا کرتی ہوئی سانجھ چڑیاں اب بھی بول رہی تھیں۔ میرا دل مینو سے باتیں کرنے اور دیکھنے کو چاہ رہا تھا یہ بلت اسے خاص طور پر اور فوراً ہی سنا دینی تھی کہ میں اب بھی اپنے نظریے پر قائم ہوں اور میں وہی سوختہ سامان ہوں جسے تم یا تمہارے گھر والے رد کر چکے ہیں۔

میرے قدم مجھے خود بخود لوکاٹوں کی ٹکڑی ہی میں لے گئے اور خود بخود یا شاید مجھے کھڑکی سے وہاں دیکھ کر مینو بھی ٹیوب ویل کے پاس سے ہوتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ وہ اس جھٹ پٹے کے وقت میرے ساتھ تنہا تھی۔ اور پر اب بھی سانجھ چڑیوں نے طوفانِ بدتمیزی مچا رکھا تھا۔ مینو کی وہاں پہنچنے کی علت میری سمجھ میں یہی آتی تھی کہ اسے مجھ سے یہ دریافت کرنا تھا "کہ کیسے اب کیا ارادے ہیں" ہم چند منٹ لوکاٹوں میں ٹھہرے ہوں گے، شاید اس نے کچھ کہا ہو لیکن چڑیوں کی ہم چیخ نے کچھ نہ سننے دیا، اور جب میں نے کچھ سنا ہی نہ تھا تو جواب کیا دیتا لیکن میں کچھ سلوں رہا جہ

سنوں۔ وہ کچھ کہے نہ کہے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ میری طرف شادی کا ہاتھ بڑھا رہی ہے۔

بینو رات بھر حدیقہ میں ٹھہر کر اگلی صبح شاہی کوٹھہ لوٹ گئی۔ اس کی اس بے توقع آمد نے میری چاہت کو ہزار گنہ رنگ دے دیا تھا۔ جب امید بر آنے لگے تو طبیعت بھڑک ہی جایا کرتی ہے۔ میں نے گل پارہ خانم کے ذریعے والدین سے کہلوایا، کہ وہ بینو کے لئے ابتدا کریں لیکن وہ تو یہ رشتہ ذرا بھی قبول کرنے کو تیار نہ تھے، والدہ برملا کہتی تھی۔ "وہ تتلی جسے ہمارے پھولوں پر سایہ ڈالنا گوارہ نہ تھا تو جب کسی کل چڑھے نے اس کے پروں میں بھمبا کا کھول دیا تو اب وہ ادھر کیوں اڑ اڑ کر آنے لگی۔ فوجیوں کی کمی نہیں۔ وہ اب بھی کوئی اور فوجی ڈھونڈ لیں۔" بس وہی اودھ کھائے امرود کا مسئلہ در پیش تھا۔ یہ لوگ بینو کو کسی صورت بھی بہو بنانے کو تیار نہ تھے۔

میں نے بینو کو چٹھی لکھی، اس میں کوئی القاب نہ تھا۔

بینو!

تمہیں معلوم ہی ہے، کہ میں تمہارے لئے کب سے بیقرار پھرتا ہوں۔ حالانکہ تمہارے والدین مجھے مسترد کر چکے ہیں.... اب کیا ہو گا؟ ادھر میرے گھر والے بھی نہیں مانتے، تم ہی کوئی ترکیب لڑاؤ۔ یہ نہ مانیں تو نہ مانیں میں اس ضمن میں آزاد ہوں اور تم بھی ......"

مینو نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ تو میں نے فون پر بات کی۔

" میرا خط پہنچ گیا ہوگا؟ "

" جی .... "

" لیکن جواب "؟

" ایسے خط شرمندہ جواب نہیں ہوا کرتے، آپ سے خط وکتابت روا نہیں "

" تو پھر میرے گھر والے تو راضی نہیں ۔ "

" وہ رضامند نہیں تو ہم بھی رضامند نہیں ۔ "

" کیوں ؟ ...... قصور ؟ "

" جب تک ہمارے والدین رضامند نہ ہوں "

" تو میں کب تک یوں بیٹھا رفتار رہوں ؟ "

جب تک پن کال نہ پڑ جائے ۔

۵

جب میں نے یہ داستان شاہی کوٹلہ کے اسی سہ منزلہ پر بیٹھ کر ساون کی ٹھنڈی ٹھنڈی، بھیگی بھیگی مگن ہوائیں سانس لیتے ہوئے جمالی کو سنائی تو اس نے کہا " عالی خاں! سب ٹھیک ٹھاک ہو جائیگا۔ چنانچہ اس نے میری عدم موجودگی میں کوئی جادو چلاتے ہوئے میرے والدین کو درست کر لیا۔ لیکن جب مینو کے گھر پیغام رسانی کی گئی، تو وہ نہ مانتے تھے ان کا خیال تھا کہ اس طرح لڑکی سسرال میں خوش نہ رہ سکے گی۔ حدیقہ

والے ہمیشہ سوچتے رہیں گے کہ اس کے ساتھ وہ حادثہ پیش آچکا ہے۔ یہ عفیفہ نہیں، اور اسی لئے ہمارے لائق بھی نہیں ہے اسے کیوں سر مڑھا گیا۔ یہ کچوکے کس سے برداشت ہو سکیں گے۔" شادی اب پھر جوکھوں میں پڑ گئی تھی۔ جمالی بینو کے گھر جانے کو تیار نہ تھا، البتہ اس نے اس کنیز کو وہاں بھیجا جس نے مرمریں صحن میں اس رات شور مچایا تھا۔ اس کنیز کے ساتھ ایک مفصّل خط، بینو کا دوپٹہ، رومال اور کانوں کا ایک جواہر جڑا آویزا بھی تھا۔ اس تلبیسی واقعے کی تہہ میں جمالی کی تیز ذہنیت کارفرما تھی۔ یہ تکلّف اس نے میرے لئے پیدا کیا تھا جن جہاں افروز بیگم بینو سمپورن تھی۔ امرود کے کسی کے ہونٹ تک مس نہ ہوئے تھے۔ لنکا کے کوٹ میں تاحال ایک ٹانکی نہ پڑی تھی۔ یہ سارا کھیل جمالی نے اپنی بات پوری کرنے کو رچایا تھا۔

اب اس عفیفہ کا رشتہ بدر سے بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن اس طرف سے جو سرد مہری برتی گئی اس نے پالا چپا دیا۔ بدر بہت تڑپا لیکن اس نے تو چراغ سے اپنی بتی خود ہی نکال لی تھی۔ اب وہ چراغ دوسرے کی بتی سے روشن ہونے والا تھا۔ اور یہ روشنی یقیناً زیادہ اجلی اور دیرپا ثابت ہونے والی تھی۔ سیکنڈ لفٹننٹ بدر کو دوسرا موقع کون دیتا۔

چھدرے چھدرے سفید سفید بادلوں میں نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔ صحن چمن میں مولسری کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ لمبے لمبے تیلیا نیلے بازوؤں اور سفید پیٹ والے پہاڑی کستورے ٹرٹر کرتے ہوئے کوٹھے کے پیش گاہ پر اڑتے بیٹھتے پھر رہے تھے۔ ان کی ٹرٹر سے چاؤ کی خوشی پھوٹ رہی

تھی۔ میں شام کے وقت لان میں سوگی اور کسمسایہ سا بیٹھا پیڈسٹل پنکھے کی ہوا کھا رہا تھا کہ جمالی نے آ کر مجھے یہ فرحت آمیز خبریں سنائیں۔ اور میں نے اس کا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ازراہِ تشکر چوم لیا۔ جو اس کی کوشش نہ ہوتی تو معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ مجھے اتنی خوشی ہو رہی تھی کہ جنگلی ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا پھرنے لگوں۔

جب اہلِ حدیقہ اور شاہی کوٹلہ والوں کی باہمی غلط فہمیاں دور ہو گئیں تو میں اور بینو دولہا دلہن بن گئے۔ میں نے اوّل ملاقات میں اس سے کہا۔

"پہلے پیار پھر شادی اور شادی کے بعد بھی مسلسل پیار۔"

"پہلے تو میرا نظریہ اس سے کچھ مختلف تھا۔ اب اپنا نظریہ کوئی نظریہ نہیں رہا۔"

"کیس لئے"

"اس لئے کہ اب تو شرعاً و عرفاً جو آپ کا نظریہ ہے، وہی میرا بھی ہے۔؟"

"پہلے تو آپ مجھے لاجواب کر دیا کرتی تھیں۔"

"اب آپ ہیں ہی ایسے لاجواب کہ جس طرح مجوسی آگ کو پوجتا ہے۔ ہمیں آپ کی پوجا کرنی چاہیئے۔"

"پہلے مجھے آپ میں بڑا دخل فصل معلوم ہوا کرتا تھا"۔۔۔۔۔۔

۔۔۔"وہ اب میں وہ دستور العمل چھوڑ چکی ہوں، اب تو لاریب آپ کی رضا

میری رضا ہے۔ اور وہ جو پہلے مجھ میں دخل فصل معلوم ہوا کرتا تھا وہ دخل فصل ہرگز نہ تھا سب مجھے تو آپ سے بڑی نزدیک کی نسبت تھی، آپ تو شہ رگ سے بھی زیادہ میرے قریب تھے۔ لیکن میری جبلت تربیت، وضع داری نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ میں آپ کو جواب باثواب نہیں دے سکتی تھی۔ مسیح مرد ہونے کے باوجود جب مصلوب کئے گئے تو چلائے تھے۔ آٹھ پہر ضبط کی سولی پر ہونے کے باوجود میرے منہ پر نالہ و فریاد نہ تھا۔ میں اپنے ضبط کی خود آپ کو داد دیا کرتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی میرا قدم بھی ڈگمگانے لگتا تھا۔ مثلاً جب آپ سپر سپر چائے پی رہے تھے تو آپ نے مجھے قتل ہی تو کر ڈالا تھا۔ آپ کے اُن سپر سپر کرتے ہوئے ہونٹوں کی جنبش کیا بتاؤں کیسی معلوم ہوتی تھی، بس میں بتا نہیں سکتی۔"

"پر آپ تو مجھے چڑانے کے لئے خود بھی سپر سپر چائے پینے لگی تھیں۔"

"آپ نے وہ سپر سپر تو ملاحظہ فرمائی تھی لیکن یہ ملاحظہ نہ فرمایا تھا کہ میں اپنے ہونٹ بھی تو کاٹ رہی تھی۔"

"لیکن جو کہیں آپ کی شادی اس فوجی سے ہو جاتی تو کیا آپ کو پھر بھی میرا خیال رہ سکتا تھا۔"

"کبھی بھی نہ رہ پاتا۔ جو میں اس کی ذراسی سرسراہٹ محسوس کرتی تو اسے اس طرح سے علیحدہ کر دیتی جیسے ترازو کے پلڑے سے تُلا ہوا بوجھ، اور میں اپنی طبیعت بدن سے ذوق و شوق کے ساتھ باندھ لیتی۔"

(ہفت روزہ نصرت لاہور)

ننگ پیری

بھر ساون کے کڈھب پانیوں سے موضع جری پوری کے تالاب لبالب ہو کر بہہ نکلے تھے۔ بھدواڑیں پانی پی پی کر خوب چھک گئی تھیں اور ان میں گھنا، زور رسا نوک پھول دے گیا تھا۔ کئی جری دھوپ نہ لگنے اور متواتر بارشوں کے کارن بیلی پڑ گئی تھی۔ غوثے نمبردار کی بالکھڑی نیلی گائے کا گریشم میں دودھ سوکھ گیا تھا۔ تو اس کے تھنوں کو بھی ہاتھ لگانے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ اب بھدواڑیں ٹھگ کر اس کا دودھ اتنا بڑھ گیا تھا کہ بچھڑی چونگھ کر قصائی کے بلے ایسی موٹی ہو گئی تھی۔ آموں کے باغوں میں ہوا کا زوردار جھونکا ٹپکے کے پھلوں کی بھد بھداہٹ ساتھ لاتا تھا۔

مینہ کی وناونی نے سدی دوج سے شروع ہو کر ناگ پنچمی اور سلونو کے تہوار گزار دیئے تھے۔ گویا آسمان پھٹ پڑا تھا۔ آج ابر غلیظ چھنٹ کر دھوپ نکلی تھی۔ گولروں اور نیموں تلے بنولیاں پھیلی ہوئی تھی۔ نیموں کی مولیں اور پتے دھوپ میں لہک رہے تھے۔ نوورہ پل کے اتر میں مہندر راجپوتوں کا دیسی آموں کا اور اس سے ادھر سڑک کے دو طرف غوثے نمبردار کے قلمی آموں کے باغ تھے۔ یہاں سے آموں کے ٹرک

شہر جارہے تھے۔ جو جری پوری سے پانچ میل پچھم میں تھا۔

ساون کے پانیوں سے پُورم پُور بھرے ہوئے تالابوں میں راج ہنس بڑی آن بان سے تیر رہے تھے۔ باغوں میں کوئلیں کوک رہی تھیں۔ گاؤں میں مرغ بانگ دے رہے تھے۔ کچھ پٹھوں نے ابھی بانگ دینی شروع کی تھی، یہ اُسی پود کا حصہ تھے جو آتی گرمیوں انڈوں سے نکلی تھی۔ کیکر پر گھونسلے میں کوؤں کے بچے بولتے توان کی چونچوں کا اندرونی حصہ شنگرفی شنگرفی دکھائی دیتا تھا۔

گاؤں کی گلیوں میں کیچل سا ہو رہا تھا، اگر پاؤں رکھتے تو ٹخنے اور پنڈلیاں تک سن جاتیں۔ لیکن شہر والی سڑک کے پار جو اونچان تھی وہاں آل کم تھی۔ اس لئے یہاں خانہ بدوش باگڑی لوہاروں نے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ اس کے جنوب میں ٹیکے پر ہریالی پھیلی ہوئی تھی جس کے دو طرف تالاب تھا۔ باگڑی لوہاروں کی کالی چھولداریاں اور ہرے ٹیکے تالاب کے پاس ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے یہ بھی اس ماحول کا حصہ ہوں۔

باگڑی لوہاروں کا قافلہ یہاں سالانہ سلونو پر آتا تھا۔ یہاں کی جگہ سنداں پہ رکھے ہوئے لال لوہے پر گبرو لوہار لڑکیاں ہتھوڑے گھن لگا رہی تھیں جن سے دھرتی دہل رہی تھی۔

جہاں شہر کے لئے ٹانگے کھڑے ہوتے تھے اسد دین پر چونیے کی جنم جلی ایسی گوری لڑکی شکل پکش اور گولر کے سے گالوں والا لڑکا سبھاش لال لوہاروں کے پڑاؤ کی طرف جا رہے تھے۔ کچی پکی گلیوں کے سبب انہوں نے

جوتے نہیں پہنے ہوئے تھے ۔ شنکل کی کرتی کا رنگ ہلکا جوگیا تھا۔ اور گھگری ہلکی ہرمزی ، اس کے کانوں کے انار کلی گوشوارے ہل ہل کر طنازی اور طمطراق دکھا رہے تھے ۔ ناک کی ترتبی نقرئی پھلی کا رنگ چہرے سے ہیٹا تھا ۔

جب بہن بھائی سادھو کی مڑھی کے پاس پہنچے تو گردھر گھاٹیا کھیرا ابھی باگڑی لوہاروں سے کلہاڑی خرید کر لاتا ہوا مل گیا ۔ وہ شنکل کو یوں دیکھتے ہوئے جیسے وہ اُسے جستجو کے بعد ملی ہو ایک دھاپ تک چلا گیا ۔ سوبس لال کو کھیرے کی یہ دیدہ دلیری ناگوار گذری تو اس نے اسے مکا دکھا دیا ۔ اب یہ تو ٹھہر گیا اور وہ گذرتے ہوئے چلے گئے ۔

تھوڑی دیر بعد کھیرے کی یہ حالت ہوئی جیسے وہ اپنی عزیز چیز کو ہوائی اڈے پر چھوڑنے گیا ہے ، وہ گینگ وے سے جہاز میں بیٹھ گئی ۔ پھر جہاز اڑا ۔ اس کی نگاہیں جہاز پہ تھیں ۔ پھر جہاز اوجھل ہوتے ہی اس کا دل بیوگ سے کچکنے لگا ۔ اسے شنکل کے سنے ہوئے ننگے پاؤں یاد آ رہے تھے ۔

۲

کھیرے کا اصل نام کرشن بخش تھا ، ماں باپ اس کا پکا رنگ دیکھ کر پیار میں کھیرا کہنے لگے ۔ اس کا نام منصب رائے نے رکھا تھا ۔ دو سال بعد جب سدین پہ چھونے کے لڑکی پیدا ہوئی تو اسی نے اس کا نام شنکل بخش رکھا تھا اور بعد کو پیدا ہونے والے بھائی کا نام سبھاش لال جیسے سوبس لال

یا سو بار کہنے لگے تھے۔

ہندو گاؤں والے بچوں کا نام منصب رائے ہی سے رکھواتے تھے جس کی فیس چار آنے تھی۔ جنم کنڈلی دیکھنے کا یا شبھ لگن بتانے کا وہ ایک روپیہ لیتا تھا۔ نام رکھنے کی اجرت تو اسے مل جاتی تھی لیکن جنم کنڈلی کا روپیہ دقّت سے وصول ہوتا اور جو یہ نہ ملتا تو کہنے لگتا۔ میں نے اس بچہ کی کنڈلی دیکھ لی ہے۔ قسمت بڑی اشبھ ہے۔ کرشن پکش، کھیرے اور شکل پکش کی بابت بھی اس نے یہی کہا تھا کہ ان کی قسمت بُری ہی ہے کیونکہ اسے روپیہ نہیں ملا تھا۔

اسے کچھ جوتش شاید آتی ہو، بیدائی نہیں آتی تھی۔ وید وہ اس دن مشہور ہوا تھا جب اس نے بوتلوں میں بھرا ہوا رنگین پانی، اور ڈبوں میں رکھا ہوا آڑ کباڑ اپنے ویدک اوشدھالیہ سے باہر پھینک دیا تھا اور بھری پینٹھ میں گرہ نگ ماری تھی کہ دوائیاں پرانی، کم اثر ہو رہی تھیں انہیں ضائع کر رہا ہوں، ان کی جگہ نئی زود اثر دوائیں استعمال کرونگا۔ نقصان کی پرواہ نہیں۔ نہ مجھے لابھ ہے۔

وہ پنڈت مدن موہن مالویہ آنجہانی کی طرح سر پہ دستارچہ رکھتا تھا۔ کمر اور کاندھے میں پھینچے کی طرح سے پڑا ہوا پٹکا۔ دستارچہ بیدائی کی نشانی تھا۔ پٹکا جوتش کی۔ وہ خود کو وید جوتشی جی کہلایا کرتا تھا۔ اگر کوئی صرف وید جی یا جوتشی جی کہہ دیتا تو اس کے ماتھے پر بل پڑ جاتے۔ آنکھ، کان، دانت کی دوائیاں اس کے ویدک اوشدھالیہ سے مفت تقسیم ہوتی تھیں۔ لیکن کوئی اگر صرف

وید جی یا جوتشی جی کہہ دیتا تو اسے یہ دعائیں دیلتیں صحیح مخاطب پر البتہ یہ سزا معاف کر دی جاتی تھی۔ جو بچہ وید جی جوتشی جی کہہ دیتا تو اسے گھیلو ملتا جو ایک نمکین کی گرہ ہوتی تھی۔

اپنی بیداٹی کی بڑ ہانکنی ہوتی تو زکام کھانسی، بخار کے معمولی مریضوں کا علاج کرتے ہوئے دعویٰ کرتا کہ مجھے جوتش سے بھی معلوم ہو گیا ہے کہ یہ مریض ضرور اچھا ہو جائے گا۔ اور مریض اچھا ہو بھی جاتا تو وہ خوشی میں اپنے علم کا چرچا کرنے کے لئے نستعلیق بولنے کی کوشش کرتا ہوا کچھ کا کچھ بول جاتا۔ مثلاً غوثے نمبردار کو غوشا نمبردار کہتا۔ گنواری سے اُسے پرہیز تھا۔

منصب رائے کو ساہنپن کی بیماری تھی۔ داڑھی، مونچھ، اور بھوؤں کے بال تو پہلے ہی گر چکے تھے۔ اب گنج ہو اجا رہا تھا۔ صورت عجب مضحکہ خیز تھی۔ رنگ لال تھا۔ اسے ماٹھو اور ماٹھو مچھندر بھی کہتے تھے۔ یہ نام اسے کیسے ملے ایک دلچسپ بیان ہے۔

اوشدھالیہ کے باہر گلی میں ایک تختہ سیاہ لگا ہوا تھا جس پر وہ جوتش کا حساب دیکھ کر ہر روز چاک سے دشاشول لکھ دیا کرتا تھا یعنی آج کدھر سفر کرنا منحوس ہے۔ ان پڑھوں کے لئے منحوس سمت کی طرف تیر بنا دیا جاتا تھا۔ سوبس لال کو کچھ ڈرائنگ اچھی آتی تھی، ایک مرتبہ اس نے تختہ سیاہ پر بندر اور اس کی دم بنا کر نیچے لکھ دیا۔ منصب رائے ماٹھو ماٹھو مچھندر

اس قلم کاری کو دیکھنے کے لئے وہاں ایک اچھا مجمع ہو گیا۔ جس میں کچھ مقامی پرائمری سکول کے طالب علم تھے۔ جو نعرے لگانے لگے....

منصب رائے۔ ماٹھو، ماٹھو مچھندر۔ انہی میں سوبیس لال نعرے لگانے لگا۔ ماشو۔ ماشو مشندر۔ ٹھے اور چھے کی جگہ شین کا استعمال اس لئے کیا گیا تھا کہ وید جوتشی جی غوثے کو غوشا اور سوبیس کو شباس کہتا تھا۔ اوشدھالیہ کا ملازم یہ بے ادبی روک ہی رہا تھا کہ منصب رائے آگیا۔ اس نے جو یہ نقشہ دیکھا تو پہلے تو بورڈ کی تحریر ہاتھوں سے مٹائی اور پھر اندر سے چھڑی اٹھا لا کر گالیاں دیتا ہوا مجمع پہ پل پڑا۔ اس کا گدی کتا جھبو نامی ایک طرف ہٹا بھونک رہا تھا۔

مجمع منتشر تو ہو گیا۔ لیکن لڑکے دور کھڑے ہوئے تالیاں بجا کر وہی نعرے لگا رہے تھے۔ منصب رائے   وید جوتشی نے ان کا تعاقب کیا۔ تو کوئی کہیں کوئی کہیں کھڑا یہی نعرے لگا رہا تھا۔ پھر جس طرح اورنگ زیب مرہٹوں کے قلعے اور مڑھیاں تو سر کر سکا لیکن مرہٹہ قوم کو زیر نہ کر سکا۔ منصب رائے نے لڑکوں کو کمین گاہوں سے بھگا دیا لیکن وہ شہر پہ فتح نہ پا سکا۔ اگلے روز وہ سوبیس لال کی شکایت کرنے سکول پہنچا۔ وہاں چھٹی ہو رہی تھی۔ لڑکوں نے پھر وہی نعرہ لگا دیا۔ وہ تاؤ کھا کر چلا آیا اور تختہ سیاہ اتار کر اندر رکھ لیا۔ اور یوں وید جوتشی منصب رائے ماشو اور ماٹھو مچھندر بھی بن گیا۔

انہی دنوں کوئی منصب رائے کو چکوروں کا جوڑا دے گیا۔ وہ اس پر اتنا مائل ہوا کہ مریض آئے ہوئے ہیں اور وہ چکوروں کے پاس بیٹھا فضول سیٹیاں بجا رہا ہے کہ وہ بولیں گے حالانکہ سیٹی پر تیتر بولتا ہے اور چکور تو خود ہی اس طرح بولتا ہے جیسے انسان ہنس رہا ہو۔ جب یہ چکور ہنسنے لگتے تو جس لڑکے

کو دیکھو او شدھالیہ کے پاس سے ہنستا ہوا گذر رہا ہے۔ منصب بلانے اس پر بھی کڑھنے لگا۔ اب اس نے تحمل برتا۔ کچھ دن گون متھسون رہنے کے بعد جوڑا واپس کر دیا۔ لوگ پھر آ آ کر پوچھتے تھے! "ویدجی، جوتشی جی۔ چکور کہاں گئے؟ بڑی سوہنی جوڑی تھی" دوسرا جواب دیتا" اڑ گئے ہوں گے۔"

ویدجی کے گدی کے گئے بھبّو کا جسم اور چہرہ مہرا اسی جیسا تھا۔ دونوں کے ہاتھ پاؤں بڑے بڑے تھے، اچی ہوئی آنکھیں اور پھولا ہوا منہ۔ دونوں ہی بھولے بھالے معلوم ہوتے تھے۔ کتا ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ کئی مرتبہ کتے نے اس کے پیچھے پیچھے مندر کا پرکرما بھی کیا تھا۔

۴

جری پوری کی آبادی ایک ہزار ہو گی جہاں ایک پرائمری اسکول بھی تھا۔ اتوار کو پینٹھ لگتی تھی۔ کھیرے کے باپ گروھر گھاٹیے کی چھوٹی سی کچی پکی حویلی مندر کے پاس تھی۔ شکل کا غلانی اینٹوں والا گھر اسکول کے سامنے پینٹھ والے میں تھے۔ پینٹھ والے کی دو دکانوں اور کھلی جگہ کا مالک غوثہ تھا۔ کھلی جگہ سے چنگی پینٹھ کی آمدنی ہوتی تھی اور دو دکانوں سے کرایا آتا تھا۔ سدین پرچونیے کی دو دکان کھی ہیں مدرسے کے پیچھے تھی۔ سو یا یونہی شوقیہ طور پر کبھی کبھی پینٹھ میں پھل بیچنے بیٹھ جایا کرتا تھا ورنہ ویسے سدین کی جو کھی آمدنی تھی۔

ایک مشہور کہاوت ہے جو برہمن گورا نہیں، وہ برہمن نہیں جو چمار کالا نہیں وہ چمار نہیں۔ یعنی اگر ایسا ہو تو ان میں کھوٹ ہوتا ہے۔ شکل کی چندر بلی

ایسی رنگت اس کی بین دلیل تھی کہ وہ نسل دار برہمن ہے۔ کھیرا اور اس کا باپ گاٹے تھے۔

اتوار کی پینٹھ لگی تو کھیرے نے دیکھا سوبس لال آم بیچ رہا ہے۔ اس نے سوبس سے بھاؤ کی بات چیت کی۔ لڑکے نے دام بازاری نرخ سے گئی گنہ زیادہ بتائے تاکہ کھیرا آم نہ خرید سکے اور چلا جائے۔ لیکن کھیرے نے تو منہ مانگے دام دیئے۔ حالانکہ سوبے نے اسے مزید بدکانے کو ڈنڈی بھی ماری تھی۔ پھر کھیرے نے بھولا بن کر کہا " وہ کون تھی تیرے گیل، ننگ پیری ؟"

سوبا :۔ کون

کھیرا :۔ ننگ پیری

سوبا :۔ کدھر ؟

کھیرا :۔ جب باگڑی لوہار دیکھے دھورے آئے ہوئے تھے۔

سوبا :۔ اس کا ناؤں ننگ پیری نہیں۔ وہ تو میری بڈھی بہن شکل پکش ہے۔

کھیرا :۔ اُنتو میری رام رام کہہ دیئے۔

سوبا :۔ ہم تجھے کیا جانیں۔

کھیرا :۔ میں گرو دھر گھاٹیئے کا کرشن پکش ہوں۔ مجھے کھیرا بھی کہہ دیں ہیں۔

سوبا :۔ میں نہیں کہنے کا۔ جا۔ جا۔

سوبس لال نے کھیرے کا سلام اپنی بہن تک نہیں پہنچایا۔ اس دن

گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ برساتی امرود چل گیا اور اب سوبے کے ٹوکرے میں امرود تھے۔ جب کھیرا خریدنے آیا تو سوبے نے پھر زیادہ اور بے جا طلبی کی.... کھیرے نے پھر منہ مانگے دام دیئے اور سوبے نے اسے دکھلانے کے لئے جھوک ماری۔ کھیرے نے تقریب گفتار کی طرح ڈالتے ہوئے کہا۔

"امرودوں کے دام لے لئے؟"

سوبا:۔ جانے دئے جا

کھیرا:۔ بگڑن کیوں لگا؟ ہر بکھت کا جھگڑا اچھا نہیں ہوتا۔ ننگ پیری کے لئے رام رام بھی لیتا جا۔

سوبا:۔ پہلوں سے گیا تھا۔ اُننے برا مانا۔

کھیرا:۔ برا کس طروں مانا تھا۔؟

سُوبا:۔ کہے تھی ہیں ننگ پیری تو وہ کھیرا ہے۔ جیسے پچھڑے کھیرے ہوں ہیں۔ جننے مجھے دھکے دھورے پھر کوڑوں کی طرح دکھا تھا۔ سرچنہار اس کا صفایا کر دے۔

کھیرا:۔ کہہ یا ہر تا میرا صفایا ہو گیا تو تیں بھی بچنے کی نہیں۔ ہم ایک ہی شے کے دو ٹکڑے ہیں۔ وہ چاندنی ہے میں اندھیرا۔ وہ سدی میں بندی، ہم دونوں سدا کے ایک ہی ہیں۔ اُسے کہنا بس اسی بات پر میرے ساتھ پھیرے پھیر والے۔

سوبا:۔ تینئں گھاٹیا، ہم ساگنی، اگنی ہوتری تیں تو مھارے حلیوں کا کبیں ہے گاتا۔

کھیرا :۔ کہیں تو ہم نہیں

سوبا :۔ گھاٹیے تو ہو؟

کھیرا :۔ ہیں، پر تمہاری ہی طروں کے باہمن

سوبا :۔ اڑے کئیے بھی، تو باہمن ہیں، پر تم بھی گاتے وہ بھی گاتے۔ تم گھاٹ پہ یاتری بھگتوں کے کپڑوں کی دیکھ بھال کرتے ہو، انہیں سنیچر کے دن کالے کپڑے اور تیل دیتے ہیں۔ تمہارا اُن کا میل ہے، ہمارا تمہارا نہیں۔ کاگ کبوتر ایک چکس پہ نہیں بیٹھا کرتے۔ ہمیں لوگ پالاگن کریں ہیں

کھیرا :۔ پوچھ تو دیکھتا۔

سوبا :۔ اچھا جا، کیا پیچھے پڑ گیا ہے، میں کوئی اگوا ہوں۔

آتے تو اور یہ دونوں بیٹھ والے ہیں ملے۔ اب سوہن لال کی گفتگو امید افزا تھی۔ شکل بکش نے کہلا کر بھیجا تھا کہ وہ کھیرے سے آپ بات کریگی اسے اُس کا اصلی نام سن کر کچھ انس سا ہو گیا تھا۔

۴

اگلے دن شکل بکش گھاٹیے کے چبوترے کے پاس سے گزرتی ہوئی پیٹھ والے میں جانے والی تھی۔ اور کھیرا مونڈھا بچھاتے چبوترے پر اُس سارے تلے بیٹھنے والا تھا۔ اساسے پر مالتی چڑھی ہوئی تھی۔ کھیرے نے نائی سے بال بنوائے، شیو کرایا، مانگ نکالی، ململ کا بیل دار کرتا پہنا، چوڑی کنّی کی دھوتی باندھی اور مونڈھے پر ڈٹ گیا۔

اسے بیٹھے ہوئے چند منٹ ہوئے تھے کہ چندیلی ایسی شکل بلا اٹک مٹک، گوری ایسے اور فربہ گاؤں والے بھائی کے ساتھ کترا کر پاس سے گذرتی ہوئی پل گئی۔ سامنے سے غوشا نمبردار اور گردھر گھاٹیا آ رہے تھے۔ شکل نے زری کا چار و جوتا پہنا ہوا تھا۔ آسمانی دوپٹے نے اس کے چہرے کو ایسی عمدگی بخشی ہوئی تھی کہ وہ تال میں کھڑے کمل سے بازی لے گیا تھا۔ کھیرے کو اس کے پاؤں میں جوتی دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی۔ وہ اب اسے ننگ پیری نہیں کہہ سکتا تھا۔

کھیرے کو یقین تھا کہ شکل ضرور بات کرتی اور آنے والوں کے کارن ہی کترا کر گذری ہے۔ لیکن تیسرے روز شوبے کی اس آواز نے اسے چونکا دیا۔

"وہ کہے ہے، تیں تو بھونڈا ہے، ہم اگنی ہو تری ہیں، تیں گھاٹیا۔ نگر کے چاروں اور رہتا پھر، اپنے سر پہ استرا پھروائے کے کلہاڑی مار لوں گی۔ اس گیل بیاہ نہ کراؤں گی۔"

یہ سنتے ہی کھیرے کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی جکی کا اچھر یا گاڑی کی دونوں پھڑیں ایک ساتھ کٹ سے ٹوٹ گئی ہوں۔ وہ اٹھ کر کچے راستے سے نورے والی ندی کی طرف چل دیا۔ جو گاؤں سے ڈیڑھ میل تھی۔ اس کا سر کئی من کا ہو رہا تھا اور آتما کھنڈری ہوئی تھی۔ اُتر سے رہ بیٹھے اور کاجل ایسی گھمگھم رعب دار بے پناہ گھٹا بڑی دھمادھمی کے ساتھ امنڈی آ رہی تھی۔ وہ ابھی گونڈ میں تھا۔ جہاں دونوں طرف کنجن چوپر دھانوں کی ہریائی پھیلی ہوئی تھی اور کہیں کہیں پانی کے مارے ہوئے مکئی چری کے پیلے پڑے ہوئے کھیت تھے کہ دھوپ غائب ہو کر گہری چھاؤں ہو گئی۔ بہشت کی ہوا کے بھیگے بھیگے جھکوروں نے

اس کا پسینہ سکھا دیا۔

اِس ہوا میں کنٹی کے سٹوں کے اوپر کی سنہری، گلابی بھامنی چڑیاں اس طرح ہل رہی تھیں جیسے رنگین تتلیاں یا آگ بھبھوڑ نڈے ناچ رہے ہوں .... چھتر دھاری چھتنار سے آم پر جسے رستم خاں کا اسوجیہ کہتے تھے، کیونکہ اس کا پھل بہت پچھیتا آخیر اسوج میں تیار ہوتا تھا، کچھ پیلک اور مہوکے بیٹھے ہوئے بالسری میں بدھائی سی گا رہے تھے، امرودوں میں پھٹکیاں اور چتیہ دُم بول رہی تھیں۔ تیز آسمانی بازوں اور دودھیا پیٹ والے پہاڑی کستورے اُوپر چیٹ چٹ پٹاچٹ کرتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ جنگلی کبوتروں کی ڈار ندی کی طرف سے آتی ہوئی مندر پہ بیٹھنے کے لیے جا رہی تھی کہ اس نے گاؤں پر کوئی شکرا اڑتا ہوا دیکھا اور وہ نودرہ کی جانب مڑ گئی۔

برساؤ اور ٹپکاؤ بادل ذرا سے چھونے کے بعد بے پرے شہر کی طرف ڈھل گیا لیکن ٹھنڈی ہوا شام اندھیرے تک چلتی رہی۔ گیرا ندی کے کنارے چکڑ پر اُگے ہوئے جھاؤ، جھنگر، اور جھاڑ جھنکاڑ میں پھر گرد واپس آگیا۔

۵

یوں تقریباً مہینہ گذر گیا۔ اب برسات خوب پک چکی تھی۔ توریٔ سبز نوار کے زرد، بانسے کے سفید، گل عباس کے زرد و گلابی پھول بھیرنل، اکھورنوں، اور کونوں کھدروں میں کھل رہے تھے۔ سب سے زیادہ بہار روکھے پر تھی جس

کے پھولوں اور بیلوں کا عکس تالاب کے پانی میں پڑ رہا تھا۔ جہاں بارعب راج ہنس تیر رہے تھے۔

رستم خاں کے اس بچے کا آم شہر جا رہا تھا۔ عام پرندوں کے بچے بڑے ہو کر ماں باپ سے الگ ہو چکے تھے۔ صرف کوؤں کا کوئی کوئی جوڑا اپنے بچوں کو ابھی تک ساتھ لیے پھر رہا تھا...... جب یہ جوان بچے بولتے تو اب بھی ان کی چونچوں کا اندرونی حصہ شنگرفی شنگرفی نظر آتا۔ کہیں گوسل بھی برابر کے بچوں کو ساتھ اٹھائے پھر رہی تھی...... کالی کوئل اور مہوکے جا چکے تھے۔ کلسرے پپیہے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ مکئی میں لگی ہوئی پھوٹ کی پچھیتی فصل چل رہی تھی۔ گاؤں میں کوئی کوئی ہیضے کا کیس ہو رہا تھا، غوثے نمبردار کا جوان بیٹا اور بھتیجا بھی اس مرض میں مر چکے تھے۔ جس کی ذمہ داری وید جوتشی منصب ماٹے پر تھی...... کیونکہ وہ اچھا معالج نہیں تھا۔

کھیرا اپنے چبوترے کے آگے ڈیک کی ٹھنڈی اور ہری چھاؤں میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس پیڑ کے پرت اوپر پرت والے پتے پچھوا کی مست لہر میں دندنا رہے تھے۔ سہجنے اور لسوڑوں پہ گلدُمیں ڈول رہی تھیں۔ کیکر پر جھنجھ میں بئے جھولا جھول رہے تھے۔ احاطے کی پچھلی دیوار میں ابابیلوں کا گھر تھا۔ جس میں وہ آ جا رہی تھیں۔ کوئی کنوئیں سے سوت کی ڈوری والی ٹنیا میں پانی کھینچ کھینچ کر نہا رہا تھا...... نزدیک ہی سبزی کی وہ ڈیڑھ بیگھی کیاری تھی جس میں گردھر گھاٹیے نے بھنڈی، کدو، میٹھا، ٹنڈسا، تاگرمو تھا، گل وہ پھر بگ منڈی بویا ہوا تھا...... اس کی باڑ پر کریلے کے زرد پھول بہار دے

وہیں تھے کھیرے کو خبر ملی کہ شنگل پکش کو ہیضہ ہو گیا - اس مرض میں فوری علاج نہ ہو تو مریض کے جسم سے سب پانی خارج ہو کر موت واقع ہو جاتی ہے - دولت مہند غورشے نمبردار کا بیٹا اور بھتیجہ صحیح علاج نہ ہونے کے سبب ہلاک ہو گئے تھے، کھیرے کو اس کا علم تھا - اس نے دھکے سے سالم ٹلگے کی اجرت ٹھہرائی اور ڈاکٹر لینے کے لئے شہر روانہ ہو گیا ... شنگل پکش تو کھیرے کو شادی سے جواب دے چکی تھی، ایک گھاٹیے اور اگنی ہوتری میں بیاہ ہو ہی نہیں سکتا تھا لیکن کھیرے کو پھر بھی شنگل پکش کو بچانے کی فکر تھی -

تانگا دیوی ندی کے پل پر جو گاؤں سے دو میل تھا، گھوڑے نے ہٹ شروع کر دی - یہیں ماتا مندر کے مقدس گھاٹ پر یاتری نہا رہے تھے - اور کھیرے کا باپ، گردھر گھاٹیا اشنان کرنے والے جاتریوں کے کپڑوں کی حفاظت کر رہا تھا - گھوڑے نے ہٹ کرتے ہوئے سڑک چھوڑ دی اور گھاٹ پر گردھر کے نزدیک آ گیا - کھیرے نے جست لگائی تو اس کا پاؤں پائے دان میں آ کر زخمی ہو گیا .... اس کے باپ نے کئی آوازیں دیں "ابے کھیرے ٹھہر تو، ٹھہر تو، کہاں جا رہا ہے" لیکن کھیرا نہ ٹھہرا اس نے جوں توں کر کے زخمی اور خون آلودہ پاؤں سے تین میل کی مسافت طے کی اور شہر سے ڈاکٹر کو جری پور بھیجنے میں کامیاب ہو گیا - اس نے ڈاکٹر کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ شنگل پکش کا علاج یہ کہہ کر کرے کہ وہ سرکاری ڈاکٹر ہے -

ڈاکٹر ایک گھنٹہ بعد پہنچا تو شنگل پکش پرلوک سدھار چکی ہوتی - کیونکہ اس کے بدن کا پانی قریب الاختتام تھا - اس کے باپ کی آنکھیں اب کھلی

تھیں، ورنہ وہ تو ویدجی جوتشی جی کے اوشدھالئے سے دوائیاں لا رہا تھا۔

کھیرے کے بھیجے ہوئے ڈاکٹر کو اتفاقاً ایک دوست کی بس مل گئی تھی۔ جو جری پور کے رستے آگے جا رہا تھا اس میں صرف ایک سیٹ تھی۔ ڈاکٹر کی فیس ادا کر کے کھیرے کے پاس نہ کھانے کے دام بچے تھے نہ واپسی کا کرایہ ۔ وہ رات ہوئے شہر سے بھوکا اور سوجے زخمی پاؤں سے بمشکل پیدل چلتا ہوا گھر پہنچا تھا۔ اس وقت کتے مرغیوں کو اٹھائے جانے والے گیدڑوں کا تعاقب کر رہے تھے۔

باپ کے ڈر سے اس نے گھر آ کر روٹی نہ مانگی تھی اور چبوترے پر اسارے میں کھری سی چارپائی پر سو گیا تھا۔ رات بھر امس رہی۔ کھیرا اپنی چارپائی باہر نہ لا سکا کیونکہ تھکن اور پیر کے درد نے اس میں اتنی بھی سکت نہ چھوڑی تھی کہ وہ اٹھ ہی سکے۔ علی الصبح جب مندر میں گھنٹے اور سنکھ بجے تو گھور بادل آ گیا۔ ساتھ ٹھنڈی ہوا بھی آئی اور پھر دن چڑھے تک زور سے برستا رہا۔ ابابیلیں گھونسلے میں بیٹھی ہوئی بولتی رہی تھیں کہ کب کھلے اور وہ باہر اڑیں۔

جب شکل بکیش خطرے سے باہر ہو گئی تو ڈاکٹر سے نہ رہا گیا۔ وہ کھیرے کی کارگذاری بتاتے ہوئے اس کی ستائش کرنے لگا کہ وہ کیسا مخلص ہے کہ اسی نے مریضہ کی واقعی جان بچائی ہے ..... شکل کو یہ سن کر بڑا تعجب ہوا۔ وہ سوچنے لگی۔ "میں نے تو اُسے کہلا کر بھیجا تھا کہ وہ بھونڈا ہے۔" .... کاگ کبوتر ایک چلس پر نہیں بیٹھا کرتے۔

وہ یہ سوچ رہی تھی کہ سو با آ گیا۔ اس نے اپنا سر بمشکل تکیے سے اٹھانے کی

کوشش کرتے ہوئے بھائی سے کہا۔

"ڈانگدار صاحب کو میرے لئے کھیرے نے بھیجا تھا۔ نہیں تو میں چٹ پٹ ہوگئی ہوتی۔ بھیں، دوا دارو کے دام، بھاڑا اسی نے دیا۔ تیں انو جا کے کہہ دے، تیں میری جان بچائی ہے، جو من میں آئے مانگ۔"

سوبس لال :۔ گیا کھر وہ کیا مانگ ہے۔

شکل :۔ انو کہہ دے، جو شے وہ مانگے گا ملے گی۔

اسی زمانے میں کوئی ویدجی جوتشی جی سے آنکھوں کی دوا لینے آیا۔ قضارا اس کے منہ سے نکلا "جوتشی جی" اس پہ وید کی تیوری چڑھ گئی اور وہ غصہ میں بولا تیری آنکھاں نئیں دکھ رہئیں۔ ان میں تو ناخونا ہو گیا تھا۔ شہر جا کے ڈاکٹر سے علاج کرا۔" مریض کی آنکھیں واقعی دکھنے آ رہی تھیں، ناخونا نہ تھا۔ اس نے جل کر جواب دیا "جی تم تو نرے جوتشی ہو، جبھی تو گوشے نمبردار کا پوت اور بھتیج بھو مار دیئے۔ سدین پر چونے کی ڈھی تمہارے ہاتھوں پڑ جاتی تو انو بھی مرگھٹ پچا دیتے۔

۶

جب سوبا تویدہ لے کر کھیرے کے پاس پہنچا تو مینہ کی خوشخبری لانے والی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کھیرا اپنے پٹیوں بندھے زخمی پاؤں کو لئے ہوئے ڈیک تلے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ ابابیلیں بولتی ہوئی اُسارے میں آ جا رہی تھیں۔ سوبے نے ایسی صورت بنا رکھی تھی جیسے وہ وہاں ارادتاً نہیں بلکہ بھٹک کر آ گیا

ہو۔ پھر مینہ کا تڑ بڑا پڑنے لگا۔ ابابیلیں اپنے گھونسلے میں جا چھپیں۔ کھیرا اپنا ٹمیوں بندھا پاؤں لئے ہوئے اسارے میں زمین پر جا بیٹھا۔ دو بھٹکے ہوئے کبوتر بھی وہاں آ گئے۔ سوبا چار پائی اسارے میں سے آیا اور اس نے بھٹکے ہوئے کبوتر پکڑنے کی کوشش کی۔ کبوتر باہر اُڑ گئے۔

پھر گھمسان کی بارش آ گئی.......... آدھا اُسارا بوچھاڑ کی زد میں تھا۔ سوبے نے چار پائی غربی دیوار سے ملا دی اور کھیرے کو اس پر لٹا کر آپ پائنتی کی طرف بیٹھ گیا۔ پانی کی گھما گھمی میں ان دونوں نے کوئی بات نہیں کی۔ جب پانی گلیوں میں راج باہے چلا کر آدھ گھنٹے بعد تھما تو ابابیلیں تو اڑتی ہوئی باہر گئیں اور سوبے نے کہا۔

"جنتے شہر سے ڈانگدار بھیجا بھیس دی، شکل نے انتو رام رام بھیجی ہے اور کہا ہے وہ جو شے مانگے گا، انتو ملے گی۔"

اب کھیرے کو یقین ہو گیا کہ شکل پکش اس کے ساتھ ہے۔ گو ڈاکر جا چکا تھا لیکن ڈاکر لانے والے کی گمرگناری سارے گاؤں میں مشہور ہو چکی تھی کہ جو وہ ہمت نہ کرتا تو شکل نہ بچتی۔ لڑکی کے مشکور باپ نے سو روپے گرنھ گھلا بیٹے کے پاس بھیجے وہ انہیں سدین پر چونئے کو واپس کر آیا کہ جیسے لڑکی اس کی ہے ویسی ہی اس کی ہے۔

کھیر اگھاٹیا برہمن تھا اور شکل سا گنی برہمن تھی اور انہیں اگنی ہوتری بھی کہتے تھے۔ یہ اونچا گورت تھا۔ عام حالات میں کوئی اگنی ہوتری اپنی بیٹی گھاٹیوں میں نہیں دے سکتا۔ البتہ گھاٹیوں اور اٹنیکیوں میں ناتے ہوتے رہتے تھے شکل کی

رضامندی بیکار تھی۔ بیاہ کا اختیار باپ اور برادری کو تھا۔ لیکن سارے ہی گرام واسی، کیا ہندو کیا مسلمان، شگل اور لکھیرے کا بیاہ کرانے پر تلے ہوئے تھے۔
غوثہ نمبر دار جو گاؤں کا سب سے معتبر، دولت مند، صاحب وقار اور پنچایتوں میں اپنی بات منوانے والا تھا۔ اس کی رائے میں یہ شادی ضرور ہونی چاہیے تھی۔ اس نے سدین کو پرچون کے کاروبار کے لئے روپیہ دیا تھا، اور پیٹھ والے میں دوکان واجبی کرایے پر دی تھی۔ یوں سدین مرفہ الحال ہو گیا تھا۔

وید جوتشی کی منطق اوروں سے علیحدہ تھی۔ وہ کہتا تھا کہ جب اس نے شگل پکشں کا نام رکھا تھا۔ اسے علم جوتش سے اس وقت بھی پتہ تھا کہ ان دونوں کا بیاہ ہو گا۔ اسی لئے اس نے ان دونوں کے نام ملتے جلتے رکھے تھے۔

وید نے ان دونوں کی جنم کنڈلیاں بھی دیکھی تھیں۔ ان دونوں کو اس نے منحوس بتایا تھا جس کی وجہ اُسے ایک روپے کی عدم وصولی تھی۔ اب جو اس سے اس نحوست کی بابت پوچھا گیا تو وہ بولا میں نے ایسا اس لئے کہا تھا کہ اگنی ہوتریوں اور گھانیوں میں بیاہ نہیں ہوا کرتا۔ جو ان دونوں کا بیاہ نہ ہوا تو سارے واشی کشٹ میں آجائیں گے۔ یہ بیاہے گئے تو کلیان ہو جائے گا۔

جات پات دیکھے نہ کو
ہر کو جپے سو ھر کا ہو

وید کی منطق گاؤں والوں کو اکاش بانی معلوم ہوئی۔ اور سب سے زیادہ وہ اسی سے متاثر ہوئے۔

تو گاؤں کے ماحول، لکھیرے کے اخلاص، غوثے نمبر دار کے ندوما اور وید

جو تنشی کے انتباہ نے ذات پات کی تاریخی دیواریں توڑ کر رکھ دیں۔ ایک کم قدر گھاٹیئے برہمن کا بیاہ گراں قدر اگنی ہوتری لڑکی سے طے پا گیا اور انتظامات شروع ہو گئے۔

اب جو شکل کی شادی طے ہو گئی تھی تو اس نے کھیرے کو نور رہے پل پر بلایا جس کے جنوب میں برسات سے جلی ہوئی فالیزوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ شمال میں ہندو راجپوتوں کا دیسی آموں کا باغ تھا جس میں گھو گھو رہتے تھے۔ یہ جگہ سنسان تھی۔ کھیرا یہاں بعد مغرب پہنچ کر خوشی کی سیٹیاں بجاتا پھر رہا تھا۔

اجڑی ہوئی فالیزوں میں گیدڑ شاید اس لئے واویلا کر رہے تھے کہ جب یہاں پھل تھا تو مالک لاٹھیاں لے لے کر ان کے پیچھے دوڑتے تھے اور کتوں کو ان پر چھوڑا جاتا تھا جو انہیں دور دور تک کھدیڑ کر آتے تھے۔ اب جو یہاں جلی ہوئی بیلوں کے سوا کچھ نہ تھا، تو انہیں یہاں آنے کا یارا ہوا تھا۔ ولیسی آموں میں گھو گھو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔

جب غروب کو گھنٹہ بھر ہو گیا، تو شکل بھی وہاں پہنچ گئی، اس نے کھیرے کو دیکھ لیا، اور ایک جھاڑی میں دبکی بار خود بھی سیٹیاں بجانے لگی۔ اس کی سیٹیاں سن کر کھیرا خاموش ہو گیا تو وہ جھاڑی میں سے بولی "سیٹی باج ہو، ہو، ہو" کھیرا اس آواز پر سن سا ہو گیا۔ اب شکل نے آواز دی "پروپکار، ہو، ہو، ہو"، پھر وہ اٹک اٹک کر دھڑک پنا دکھاتے ہوئے، کالے تیتر کی ترنگی، سج دھج اور قدم بازی کے ساتھ جھاڑی سے باہر نکل آئی۔ یہ دونوں آٹھویں

درخت تلے پہنچ گئے۔ مشرق کی طرف نویں در میں نجّنے بھگو پانی جھر جھرا رہا تھا۔ اور پُل کی چھت میں چوڑے گاڈروں پر، کبوتر، اور چیمگے کے بیئے ماں باپ سے ضد کرتے ہوئے ان کے نیچے بول رہے تھے۔

یہ سردیوں کی ایک چندیلی رات تھی۔ فضا میں گویا دودھیا موتی چور گھلا ہوا تھا۔ پل کی گہری چھاؤں سفید ریت پر پڑ رہی تھی، نوور سے ادپر جو جھاؤ جھنگر، جھاڑ جھنگ تھا۔ اس میں جھکر جھینگر یاں شور مچا رہی تھیں۔ امرودوں کے باغ میں رکھوالا چمگادڑوں کو "ہا، ہا، ہا" کر کے بھگا رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کنکریوں پڑے کنستر بھی رسیاں کھینچ کھینچ کر بجائے جا رہے تھے۔ شمال مشرقی ڈھانگ پر قطار میں کھڑے ہوئے جھوٹے کا لی خف فصیل معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے اوپر چاند نکلا ہوا تھا۔ چونے کی بھٹی پر کام کرنے والی کنجی لڑکیاں ڈھولک اور بیلے پر فراغت کے گیت گا کر گھونگھرو پہنے ہوئے ناچ رہی تھیں۔ مگر سب سے زیادہ نجی شکل پکش کی حشمت اور ہاؤ بھاؤ قابلِ دید تھا۔ جو کھیرے کے ساتھ چہل بازی کا جھیڑا باندھ رہی تھی:

شکل:۔ ارے بھلا میں تجھے کیوں بلایا ہے۔

کھیرا:۔ ملن کھاطر۔

شکل:۔ "ملن کھاطر، نئیں ارے پرد پکار! بات کرن کھاطر۔ تیرا میرا بیاہ پنچوں نے پکا کر دیا؟"

کھیرا:۔ کیوں کیا تیں راجی نئیں۔

شکل:۔ میرا ا وچن تھا جو تے مانگے گا، وہ ملے گی۔ پھر راجی کیوں نہ ہوتی؟

میں وچن پورا کروں گی۔ پر سچ پوچھے تو میری نیت نہیں ہے سارے بکھیڑے!
اس جھمیلے میں نہ پڑ۔ اپنی سنک چھوڑ دے۔"

کھیرا:۔ تمیں اسے سنک کہے ہے؟

شنگی:۔ تو تمیں میرے گیل بیاہ ضرور کراوے گا۔"

کھیرا:۔ ضرور

شنگی:۔ ارے کھیرے نہ کر، نہ کر، نہ کر۔ جو میں لنگڑی، لولی، لوہلی، گونگی، اندھی نکلی؟

کھیرا:۔ تمیں ایسی کیوں ہوتی، تیری چال گوتے نمبردار کی قدم باج بچھیری کی طروں ہے۔

شنگی:۔ کیر تن بند کر۔ تمیں سمجھ ہی لنگڑی، لولی، لوہلی، گونگی، اندھی، اور کھبر نہیں کیا کیا ہوں۔ بس ست عیبی ہوں۔ میں تیرے قابل نہیں، تمیں میرے گیل بیاہ کر کے کیا لے گا۔ اسے بیاہ نہ کر، نہ کر، نہ کر............. یوں ہی ملتے رہیں گے۔

کھیرا:۔ یہ پاپ ملاپ اور کو کرم ہے۔ تمیں چاہے ست عیبی ہو، چاہے سو عیبی، میں تیرے ساتھ ضرور بیاہ کراؤں گا۔

شنگی:۔ چاہے کیسی ہی ہوں؟

کھیرا:۔ ہاں

شنگی:۔ کیوں؟

کھیرا:۔ میں تجھے اپنے پالے میں لینا چاہوں ہوں۔

شگل :۔ سنپت ہو کے سن پچھتاوے گا۔ کہے گا سا لگرام سے چنگی بھلی جوڑے آٹا پیس۔ کھالی شگل پہ نہیں جایا کرتے۔ تیں کپیلا گینی تو دیکھی ہے، پر جے دادودھ نہ دے تو کس کرم کی۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ نیت بدل دے ...... گرودھر گھاٹیے کے ......"

کھیرا :۔ تیری میری ساس ملی ہوئی ہے ہماری اچھی جوڑی بنے گی۔ میں نیت نہیں بدلوں گا۔

شگل :۔ جے کوئی بات بیاہ پیچھے معلوم پڑی ؟

کھیرا : ملوم پڑن دے۔

شگل :۔ سچ کرے گا۔

کھیرا :۔ تیرے ہوتے ہوئے رنج کہاں۔

شگل :۔ تو نیں اللجھپ نہیں، میں سدا سہاگن رہوں گی

کھیرا :۔ اور میں ٹوندہ یا سدھ رہوں گا۔ تیں گوری ہے میں کالا۔ تیں سدی ہے میں بدی، تیں شگل ہے .... میں کرشن، ہماری جان ایک ہے پکش دو۔

شگل :۔ دیدجے تشی نے تیری میری کرم ریکھ دیکھی تھی، کہے تھا بڑی اشبھ ہے :۔

کھیرا :۔ او نھ روپے جو نہیں ملے تھے۔ ماٹھو، ماٹھو مچھندر۔

شگل :۔ (ہنستے ہوئے) اچھا سے بدذات تیں مجھے ننگ پیری کیوں کہا تھا :۔

کھیرا :- چڑانے کو۔

شکل :- اب میری طرف کھوتوں کی طرح کیوں دیکھ رہا ہے۔ مجھے یوں نہ دیکھ۔

کھیرا :- لے میں پیٹھ پھیر لی۔ ستونتی، اگونتی، روپ ونتی کو نہیں دیکھوں گا۔ ساتھ ساتھ جموعوں پہ نکلے چاند کو دیکھوں گا۔

شکل :- منہ میری طرف پھیرے رہ لے مجھے یوں دیکھ جس طرح میں تجھے دیکھوں ہوں۔

کھیرا :- ؎ تیری نظراں ہیں پھر پھندی۔

کنبی لڑکیوں کے یہ بول سن کر شکل کو ہنسی آ گئی۔ پھر ان کی نظریں بے تکلفی کے ساتھ پہلی بار ملیں، نظروں کے ساتھ دل بھی مل گئے، لیکن ان کے جسم کا کوئی حصہ حتیٰ کہ ہاتھ تک ایک دوسرے کے نہ ملے۔

چونے کی کھٹی پر کنبی لڑکیاں اب بھی گا رہی تھیں..................

میری نجریں ہیں پھر پھندی

بچ کے رہیو!!!!!!

اور اس دھن کے زیر بم پہ شکل اپنی پھر پھند بھری آنکھیں پٹخانے لگی، ساتھ کے ساتھ کھیرا اس کی انگشت شہادت کو بھی تال کا ساتھ دیتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ گویا خود رقص کرتے ہوئے انگشت افشانی کر رہی تھی۔ یہ دونوں آٹھویں در ہیں جس کے نزدیک نویں میں پانی بہہ رہا تھا، ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے چکوا چکوی پاس پاس کھڑے ہوں، یا رادھا کرشن۔ ان دونوں کے دل میں خوشیوں

کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔

معلوم نہیں یہ کب تک مجالست کرتے رہتے کہ جھوعوں کی طرف سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی دیوانہ قہقہہ لگا رہا ہو۔ ساتھ گھوگھو بھی بول رہے تھے۔ نورہ پر سے کوئی ٹرک مال سے بھرا ہوا گذر رہا تھا جس کی ٹکر تیز رفتار لاری سے ہوئی اور بڑا دھماکہ ہوا۔ جبھی ان کے پاس ہی ساتویں ورہیں سے تین چار گیدڑ بھاگتے ہوئے گزرے۔ ایک لگڑ بھگڑ ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ دیوانہ کے قہقہے ایسی آواز اسی کی تھی۔ آسمان پر ایک بڑا تارا ٹوٹا تھا جس سے خوب روشنی ہو گئی تھی۔

یہ نامساعد حالات دیکھ کر جبری پوری کے یہ دونوں واسی اپنے گھر کو چل دیے۔

۷

جب کاتک چڑھا تو سکل بکش اور سوبس لال نے اکاس دیئے جلائے۔ یہ وہ چراغ ہوتے ہیں جو ہندو بانس اور بلیوں پر کاتک میں ٹانگتے ہیں کہ بارش ہو گئی ..... گرام واسیوں نے رات کے لئے ہلکی دلائیاں نکالیں، کپاس کے لوسرے اُتر رہے تھے۔ روئی اوٹنے کی دستی چرخیاں چیخ رہی تھیں۔ دھنیوں کا کاروبار چمک گیا تھا۔ برسات کے دھونے ختم ہو کر آسمان پر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ تلاؤ کے دودھیا سنگھاڑے اور نیا گڑ چل گیا تھا۔ رتیاں پک کر بیلوں تلے گر رہی تھیں۔ گاؤں دوارے پوال کے انبار لگے ہوئے تھے۔ جو بھیرڈوں کو پھاگن چیت میں مونڈا تھا اب ان کی اون بڑھ گئی تھی۔

کڑم دھم، کڑم دھم کڑم دھم کڑم دھم، مشکل اور کھیرا دھان تیرس کے ڈھول ڈھکے کے ساتھ بیاہے گئے۔ سارا گاؤں ہندو مسلمان، اس خوشی میں شریک تھا۔ شادی کی شبھ لگن وید جی جوتشی جی نے نکالی تھی۔ جو سمجھتا تھا کہ شادی کا کارن اصل میں وہی ہے۔ ہندوؤں کا تہوار دھان تیرس کاتک کو تیرھویں کو ہوتا ہے، اور یہی ساعت شادی کی لگی تو یہ بیاہ بہت مبارک سمجھا گیا۔ نمبردار نے دولہن کے لئے تیل، انگ مالا اور دولہا کے لئے موتیوں کا سہرا بھیجے تھے۔ وید جوتشی نے دلہن کو بیر بندھی چڑھائی تھی۔

سہاگ رات کی صبح تھی جب کھیرا نہار منہ کہیں چلا گیا۔ اس کی ماں بسنی روٹی پر مکھن، پھولدی پر کھیر، پتھر وٹی میں اچار اور مٹھائی لئے بیٹھی تھی کہ اسکا بیٹا دستی ملکے پر نہا دھو کر ناشتہ کرے گا۔ وہ بہو کے لئے بھی یہی کچھ بھیج رہی تھی لیکن اچھا خاصا دوپہر ہو گیا اور کھیرے کی کچھ خبر نہیں تھی، ماں نے جانا بیٹا ہی لجا سے جب تک اندر ہی بیٹھا ہے۔ مجبور ہو کر ماں نے آواز دی "ارے کھیرے، کلیجہ کرے۔" کچھ توقف کے بعد اس نے مشکل کو پکارا "روناولی رضاولی" اس نے بھی کچھ جواب نہ دیا۔ وہ رو رہی تھی۔ بہو کی ایک ہچکی نے ماں کو ڈرایا۔ وہ دروازے کے پاس آ کر چلائی "روناولی دوار کھول" دوار تو پہلے ہی بند نہیں تھا کیونکہ کھیرے کے جانے کے بعد مشکل پلنگ سے اپنی جگہ سے اٹھی بھی نہیں تھی۔۔۔ بہو کی ہچکیاں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ساس اندر چلی آئی۔

بستر اب بھی جوں کا توں بنا تنا اور اچھول تھا۔ عود سوز نے کوٹھے میں باسی خوشبو پھیلائی ہوئی تھی۔ نوشے کا سہرا کھونٹی پر ٹنگا ہوا تھا، نوشی گہنا پہنے ہوئے تھی۔ کھیر انہیں چلا گیا تھا۔ بہو سے روٹھ کے؟ اسے پسند نہیں آئی تھی؟ لیکن یہ بڑے چونچلوں کا بیاہ تھا، اور کھیر ارات تک ہشاش بشاش تھا۔ اب بہو سہاگ اتری محروم، بے حشمت، اجڑا اجاڑ کھائی سی منعدم، اور چاک گریباں بیٹھی اپنے ننگے پیروں کو دیکھ رہی تھی جو آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے، بھگوان نے جو اس کے حسن کو چیٹ پٹا بنانے کے لئے آنکھوں میں پھند کی چھوکن دی تھی، اب وہاں نہ اس کا سیٹھاپن آ گیا تھا۔ ماں فق ہو گئی تھی۔

بہو کو تو کھیرے نے بہت پسند کیا تھا لیکن وہ واقعی اس کے قابل نہ تھی، کھیرے نے دیکھا تھا کہ بہو کا حصۂ خاص ایسا ہی سپاٹ ہے جیسا اس کا ننگا پاؤں۔ مثل ناف یہاں ایک نشان ضرور تھا اور بس۔ یہ نشان اس سوئے کے ناکے جتنا ہو گا جس سے بوریاں سی جاتی ہیں۔ پھر وہ مرد قابل کیسے ہوتی۔

اگر بچپن میں اس کا اپریشن ہو جاتا تو وہ اس حالت کو نہ پہنچتی، اور جس طرح سے دولہا دلہن کے دل و نظر ایک دوسرے پر ملے تھے اسی طرح سے اُن کے جسم بھی جائز ملاپ میں ایک دوسرے سے ملتے۔ اُن کے جسم ایک دوسرے سے کیا ملتے اُن میں قدرت نے اب تو جنم بھیا تو ڈال دیا تھا۔

شُنگل سوچ رہی تھی میرا وچن تھا جو شے وہ مانگے گا اسے ملے گی۔ میرا وچن سمپورن ہوا پھر وہ دل ہی دل میں بین کرنے لگی۔

راجہ کس کے پاہونے
جوگی کس کے میت

اگر کوئی اتنا بڑا سرقہ نا ہوتا جس میں اس کی گردن اور سر آجاتے تو شُنگل کو اس میں اپنی گردن ڈال کر گنڈیری اور ساچاری امبیا کی طرح کٹوا لینے میں عذر نہ ہوتا اور کھیرے کی نظر میں شاید اسے پہاڑ کی چوٹی پہ کھڑا کر کے نیچے ٹپکنی دے دینی چاہیے تھی یا پارسیوں کے مینارِ خاموشی بٹھا دینا چاہیے تھا تاکہ اسے چیل گرگس کھا جاتے۔

کھیرا اور یہ لڑکی اب بھی ایک دوسرے سے نودرہ کی طرح جلتے رہتے تو یہ پاپ بیوہار نہ ہوتا۔ جب اسے شادی سے ناامیدی ہوگئی تھی تب بھی اس نے شُنگل کو موت کے منہ سے بچایا تھا۔ کیا وہ اس کے لئے دائمی تجرد اختیار کر سکتا تھا؟ کیا کھیرا اور شُنگل جوگن اور جوگی کی طرح نہیں رہ سکتے تھے؟ کیا اس کی موجودہ سنگت ہی لایعنی تھی؟۔

کھیرے کی ماں اپنے شوہر کے پاس گئی۔ جو اُسارے میں مونڈھا بچھائے بیٹھا تھا۔ اس کی جوتی پہ جوتی چڑھی ہوئی تھی جو سفر کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے..... ابابیلیں بولتی ہوئی اپنے گھونسلوں میں آجا رہی تھیں۔ چبوترے کے سامنے کھڑے ہوئے ڈیک کے پتے خشک تپھواہیں دم سادھے تھے۔ نیبو میاں سوکھتی جا رہی تھیں، ایک ہمیشہ کو دکر چلنے والی گوریا جس کا کام اُٹھتے

بیٹھتے، کھاتے پیتے ناچنا کودنا تھا، ٹہنی پر بیٹھی ناچ کود رہی تھی۔ شروع شروع میں گھونسلہ چھوڑ کر یہ ماں باپ کی معیت میں کبھی خود چگتی کبھی ان سے چونگا لیتی پھرتی تھی۔ اس وقت یہ ناچتی کودتی نہ تھی۔ پھر جب اسے آزادی پرواز کا پروانہ مل گیا اور والدین کی ولایت ختم ہو گئی تو اس نے ناچنا کودنا شروع کر دیا تھا فیکل بھی شادی کے بعد اب والدین کی ولایت میں نہ تھی اسے آزادی کا پروانہ مل گیا تھا۔ وہ چاہے جتنا ناچتی کودتی لیکن کھیرا الواسے بیتے جی ودھوا چھوڑ گیا تھا۔

کیکر پر چھتنگ پھوا میں جھونجھل رہے تھے۔ لیکن یہ بھی جھولا جھولنے والوں سے اسی طرح خالی تھے جس طرح شکل کا حجلۂ عروسی دلہا سے ...

سامنے سے غوشہ قدیم بازار الحق پر چلا آرہا تھا۔ جب بچھری پاس سے گذرنے لگی تو گردھر گھاٹیا ہونٹ رہے سا اٹھا۔ ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھے اور رسلام کیا۔

غوشہ گذر گیا تو کھیرے کی ماں نے اسارے میں آکر سفر کے شگون جوتی پر جوتی چڑھی، الگ کرکے کھیرے کی خبر سنائی۔ گردھر کے منہ سے ایک بول بھی نہ نکلا۔

دو تین دن تو گردھر گھاٹیا سرٹولوں کی طرح کھیرے کو ڈھونڈتا پھرتا رہا۔ لیکن اسے کوئی سن گن نہ ملی ...... پھر اس نے گھر سے ایک کمبل اٹھایا، ایک کوٹ کی لٹیا اور سوت کی ڈوری جو اس نے کمبل پر کھینچی ہوئی تھی اور لٹیا کو اس میں باندھ کر باہر لٹکایا ہوا تھا۔ اس نے

وِشاشوں پوچھے بغیر مندر میں گھنٹے بجنے سے قبل کوچ پہ کمر باندھ لی تھی۔

جب وہ تودے پر پہنچا تھا تو پیچھے سے ٹاپوں کی آواز آئی۔ غوثہ ابلق پر اپنا کھیم باجرہ والا باغ دیکھنے جا رہا تھا۔ گردھر گھاٹیے نے گرے سے اتر کر درخت کی آڑ لے لی۔ تودرہ پار کرکے وہ پکی سڑک کی بجائے اس کچی سڑک پر ہو لیا جس کے دونوں طرف کسانوں نے تھوہر لگائے ہوئے تھے۔

جس دن سے کھیرے کی خوشی آئی تھی۔ گردھر گھاٹیا باہر اسارے میں سونے لگا تھا۔ اس کی بیوی ناشتہ تیار کر لیتی تو یہ خود ہی اندر آکر کھا لیتا تھا۔ آج جب ناتھو کو دیر ہوئی تو کھیرے کی ماں کا ماتھا ٹھنکنے لگا، وہ اوکی باوَلی سی اسارے کیطرف چلی اسے جوتی پر جوتی کا خیال آرہا تھا۔ چارپائی خالی تھی۔ اُسے خود بخود رونا آگیا۔ وہ تھوڑی دیر چارپائی پہ بیٹھی تھی کہ ڈیک تلے ایک تنہا کھنا مرغا دانا پاکر مرغیوں کو ٹک ٹک کرکے بلاتا نظر آیا وہ کچھ دیر تک کھنے مرغے کو دیکھتی رہی اس کا دل کڑھ گیا اور وہ اپنے ناتھو کو ڈھونڈنے کے لئے ماتا دیوی کے گھاٹ کی طرف چل دی اس نے جھانوں سے گردھر گھاٹیے کی بابت پوچھا پاچھا پھر وہ ناگا دیوی کے ٹِپ پر کھڑی ہو گئی۔ لوگ تانگوں میں اور پیدل آجا رہے تھے، دوپہر ہوئے وہ گھر واپس ہوئی تو اس نے دیکھا کہ کمبل اور لٹیا ڈوری غائب ہیں۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ وہ بھی اناتھ رہ گئی ہے۔

آج سے ساس بہو نے اپنے بالوں کی پیٹیاں باندھ لیں تھیں یعنی مانگ

مٹا کر بال پیچھے الٹ لئے تھے جو ہندو عورتوں میں سوگ کا نشان تھا۔

جب لوگ وید جی جوتشی جی سے جا جا پوچھتے "جوتشی جی، تم نے اس بیاہ کی شبھ لگن کاڈھی تھی۔ پھر یہ کیا ہو گیا؟" تو وہ جواب دیتا "تھوڑے دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پھر اس سے سوال کرتے "تمہاری پوتھی کیا کہے ہے کد تلک ٹھیک ہو جاگا؟" تو وہ بڑبڑا کر کہتا! "شوباش لال نے میرا نام بگاڑا تھا میں نے تو اس کی بہن سے بدلا اتارا ہے۔"

یہ بات جب گاؤں میں پھیلی تو غوثا نمبردار لاٹھی لے کر وید کو اس کے ویدک اوشدھالیہ میں بیٹھ کے دن مارنے آیا۔ اس نے اپنی جان یہ کہہ کر بچائی "بھلا نمبردار جی جو میں ایسا کرتا تو شکل پکشی کو بیر بندھی کیوں چڑھاتا؟"

تر لوکی

کیکروں والے ریڑے پر پیر پھیلے ہوئے تھے۔ یہ ریڑا شکل میں گویا ہاتھی کی پیٹھ تھی۔ اس کے ملحق پورب کی جانب کافی گہرائی میں برساتی ندی کا ریت اس طرح چمک رہا تھا جیسے دھوبی گھاٹ پر سوکھتے ہوئے سفید کپڑے۔ کیونکہ دھوپ تیز تھی۔ دھوبی گھاٹ اس جگہ واقع تھا جہاں برساتی ندی متعلق نہر کو عبور کر کے غرب کی جانب بہتی ہوئی چلی گئی ہے اور اس کے دونوں کنارے پولوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ توڑیئے لوبیئے کے کھیتوں اور بیلے سے شکاریوں کے دُو کارے ہوئے خرگوش جب ان پولوں میں پہنچ جاتے تو اُن کا پانی اتنا ہی محال ہو جاتا جتنا کسی اندھیرے گنجان اور گھاؤ گھپ جنگل میں چھپے ہوئے لال کا ڈھونڈنا۔

تو ایسی دوپہری میں جب کہ ریڑے پر پھیلے ہوئے مرطوب چینوں کے دانے خود بخود چٹک رہے تھے اور بارہ ماسی بیلداروں کی چوکی کے پاس کھڑے ہوئے بہت سے سیملوں پر بیٹھے ٹونیاں اور لبیر گرمی کے سبب زرد اور سرخ چونچیں کھولے وظیفہ خوانوں کی مانند اپنی موٹی زبانیں ہلاتے ہوئے

سانس لے رہے تھے۔ موضع ڈھک فٹی کو نوبالا سلمیٰ ستارہ کچھنا گھو، کنول روپی چنچل البیلا لڑکی تزلو کی اپنی کپیلا گائے کو نہر پہ پانی پلانے کے لئے چلی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے سہ دری کے گول ستونوں کے پاس رکھے ہوئے دو پہر بیٹے کے پھولوں اور گملے میں پرورش کی ہوئی تلسی میں پانی ڈالا۔ تو اس کی ماں بولی "اس بکھت نی پانی دیا کرتے یہ جل جان گے"۔ لیکن تزلو کہاں مانتی تھی اس نے تو انہیں جی جان سے پالا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ جس طرح رنگین مہرے والی کپیلا گائے کو دو پہری میں پیاس لگتی ہے ایسے ہی انہیں بھی لگتی ہو گی۔

یہ لڑکی بدن میں دودھ چھاننے پر پڑی ہوئی لمبی اور پتلی تہہ لوگی ایسی تھی۔ اس میں نہر پار کھڑے ہوئے گوبند باغ کے آموں سے زیادہ چاشنی، ذائقہ اور مٹھاس تھا۔ اتنی بہار بسنت میں سرسوں کے زرد پھولوں بھرے سونے پڑے نہ ہو گی جو اس پر تھی۔ گاؤں میں شمال کی طرف پھیلے ہوئے پیلو، کریر اور تیندو کے جنگل میں کریر پہ سجا ہوا اگلگوں ڈیلا خوش رنگی میں تزلو کی کے اچھت اچھت اور گورے گورے گالوں کی ریس نہیں کر سکتا ہو گا جو وہ انجیری رنگ کا برقع پہنے ہوئے نقاب اٹھا کر ہجوم عشاق سے کہہ دیتی "فرہاد نے تو شیریں کے لئے کوہ بے ستون سے نہر نکالی تھی۔ آپ چاند سے نکال لاؤ تو تب جانوں"۔ تو مخلوق اس دھن میں دیوانی ہو جاتی کہ زمین پر چاند کی خشک بے آباد پہاڑیوں سے کیسے اتنا پانی اتارا جائے گا۔۔۔ کہ نہر جاری ہو سکے۔

ترلوکی کے ساتھ اس کی جھبری کتیا بھی جانے لگی تو اس کے باپ نے جھبری کو ڈیوڑھی کے آگے کمر کوٹ میں زنجیر سے باندھ دیا۔ ترلوکی نے لمبی دھاریوں کا چست سا پاجامہ بسنتی رنگ کی سادہ کرتی اور کچھ کچھ آکاشی دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں چاندی کے چھوٹے چھوٹے چوکڑے تھے۔ جن میں دو دو لاجوردی موتی لہرا رہے تھے اس کے پاس سوائے ان چوکڑوں کے کوئی گہنا نہ تھا۔

اُدھر مالک گوبند باغ کا لڑکا سرنام بھی اپنی شرنگ گھوڑی کو نہر پر پانی پلانے کیلئے نکلا تھا۔ اُس کے پاؤں میں دیسی جوتی تھی اور بائیں کان کی لو میں سونے کا چمکدار بھاری حلقہ۔ اس حلقہ کے مقابل ترلوکی کے چوکڑے اس کا واحد زیور مالیت میں پاسنگ تک نہیں تھے۔ وہ ننگی پیٹھ پر سوار تھا اور گھوڑی کے ڈھانٹی دی ہوئی تھی۔ جب وہ کمرکوٹ کے پاس سے گزرنے لگا۔ تو جھبری اس کی طرف منہ کر کے بھونکتے ہوئے زنجیر تڑانے لگی۔ ترلوکی نے اس کی نیلی دھوتی میں سے کھلی ہوئی اُجلی گوری پنڈلیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کتیا کو پچکارنا شروع کر دیا۔ اس کی پنڈلیاں گیتوں والی کچھی کی پنڈلیوں ایسی گول گول تھیں اور وہ ایسا چھریرا معلوم ہو رہا تھا جیسے سوئمبر میں پرتھوی راج سے بھی زیادہ پسند کرتے لیکن باوجود چھریرا سا دکھائی دینے کے وہ ایسا کومل کومل ملائم تھا جیسے ودیا کے بستر میں سلائیں۔ اسی لئے ترلوکی نے جھبری اس پر تقریب گفتار کی طرح ڈالنے کے لئے پچکاری تھی۔

سرنام کے گھر آٹھ بیلوں کی کھیتی ہوتی تھی۔ اس کے باپ اور تایا کا

کاروبار مشترکہ تھا۔ وہ دو سو بیگھے خام نہری اراضی کے مالک تھے۔ جس میں سے ۔۔۔۔۔۔ پچیس بیگھے کا گوبند باغ بھی تھا۔ دیہاتی علاقے میں انہیں سرمایہ دار تصور کرتے تھے۔ ہرنام کے تایا گھاسی رام کی بیوی مرگئی تو وہ محض غم غلط کرنے کے لئے لام پر چلا گیا تھا۔ واپسی پر اس کی حالت یہ تھی کہ وہ سمجھتا ہم چو ما دیگرے نیست۔ بوجہ بے اولاد ہونے کے اس کا وارث اس کا اکلوتا بھتیجا ہرنام تھا۔

گھر کے سب آدمی گھاسی رام کی بڑی للو تپو کرتے تھے اور گو وہ پلٹن میں کچھ برس صرف بطور سپاہی کے رہا تھا لیکن اپنے آپ سپہ سالار اعظم کی طرح فوجی چالوں، رسد رسانی، خطوط جنگ کا ماہر سمجھتا تھا۔ اس کی چال اب بھی فوجی سی تھی اور وہ ذرا سینہ نکال کر کچھ کچھ ہاتھ جھٹکتے ہوئے چلا کرتا تھا۔ جو وہ کھڑا ہوتا تو پریڈ کے اٹنشن سپاہی کی طرح سے ایڑیاں ملا لیتا اور آگے سے پاؤں کھلے ہوتے۔ خواہ بیاہ شادی ہو یا کسی افسر سے ملاقات وہ ایسے موقعوں پر اپنی وردی کا خاکی کوٹ ڈاٹ لیا کرتا تھا ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہوئے کرسی دار مونڈھے پر بیٹھا ہوا کبھی تو وہ کونل گارڈ کے ذکر کرتا۔ کبھی لال کرتی بازار کے، کبھی گوروں کے تو کبھی گورکھوں کے بعض مرتبہ وہ اپنے دیسی جوتے کی ایڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ اسی طرح مارتا جس طرح فوجی اٹنشن ہوتے ہوئے مارتے ہیں۔

قانون گو یا تھانیدار ڈھک ہوئی میں آتے تو یہ ان کے برابر بیٹھتا۔ ایک مرتبہ ڈپٹی کمشنر نزدیکی قصبہ جھوریہ میں آیا تو اس نے ضلع افسر کے لئے

جاب شمال ٹھیک والی تلیا کے کنارے گوچر میں تنبو گواتے۔ گوچر سے ملے ہوئے پیلو، کریہ اور تیندو کے جنگل میں اسے چیتل، سانبھر کا شکار کھلایا جس کے صلے میں گھاسی رام کو ایک نالی کارتوسی بندوق کا لائسنس ملا۔ وہ برسات کے دن تھے اور گھپ اندھیری آدھی رات جب یہ شہر سے بندوق لے کر گاؤں میں آیا اور اس نے اپنی ٹھنک دکھلانے کے لئے بارہ ہوائی فیر کئے اور دو کتوں کو چھرے مار دیئے جو لے بھونک رہے تھے۔ اس کی ضد کی انتہا یہ تھی کہ وہ اپنے حقیقی بھائی کے ساتھ ہرنام کی پیدائش کے وقت سے نہ بولا تھا کیونکہ ہرنام کے باپ نے خوشی کے ڈھول بجانے والے بڑے بھائی سے پوچھے بغیر بلائے تھے۔ ایک مرتبہ اس نے مہمانوں کی خاطر حلوائی سے ایک روپیہ کی مٹھائی خریدی اور جیب سے اٹھنی نکال کر پکڑانے لگا تو دوکاندار نے آٹھ آنے اور مانگے۔ اس نے زور کے ساتھ کہا کہ یہ تو روپیہ ہی ہے۔ دکان پر مہمان تک آگئے اور یہ سب کے سامنے اپنی اٹھنی کو روپیہ ہی بتاتا رہا۔ جب لوگوں نے اٹھنی کے نیچے روپیہ رکھ کر دکھایا کہ یہ تو چھوٹی ہے تو کہنے لگا میں نے روپیہ ہی دیا ہے اس میں چاندی روپیہ جتنی ہی ہے کیونکہ یہی زیادہ چمکدار ہے اور روپیہ مدھم ہے۔ آخر حلوائی ہی چپکا ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے کبھی حلوائی کی دوکان سے سودا نہیں خریدا۔

نزدیکی قصبہ مہوریہ میں ایک فیشن دار ہوٹل کھلا تھا جس کے دروازہ پر جالی دار کواڑ لگے ہوئے تھے۔ کہ مکھیاں اندر نہ جا سکیں۔ جیسا کہ قاعدہ ہے کہ یہ کواڑ باہر کو کھلتے تھے۔ گاؤں میں تمام کواڑ اندر ہی کو کھلتے ہیں۔ گھاسی رام جالی دار

کواٹھوں کو اندر کی طرف ٹھیلنے لگا اور وہ ضد دکھائی کہ باوجود سمجھانے کے اسی پر اڑا رہا کہ اندر کو ہی کھولوں گا۔ وہ انہیں توڑ تو نہیں سکتا تھا کیونکہ وہاں لوگ جمع ہو گئے تھے لیکن ان پہ زور سے لاٹھیاں مار کر بلا کھانا کھائے چلا گیا۔

ہرنام کے گھرانے کی وقعت اس کے تایا نے بڑھا دی تھی۔ بہیڑیوں والے گھاٹ پار گوبند باغ بھی اسی کا لگوایا ہوا تھا۔ ملکہ بابل جس کے لئے .... اس قدیم شہر میں باغ لگوائے گئے تھے وہ ان پر اتنا نہ اتراتی ہوگی جتنا یہ، وہ اس باغ کے بے تخم امرود اور بے گٹھلی آم (جس میں گٹھلی بڑے کاغذی بادام جتنی تھی) سرکاری افسروں کو دکھایا کرتا تھا۔ ہرنام کے باپ کی حیثیت اس کے مقابل کچھ بھی تو نہ تھی، یہ گویا اپنے چھوٹے بھائی کے سامنے اپنی چیچا نسی اور بڑبسری جتاتا رہتا تھا۔ اور ہرنام کو سب لوگ گھاسی رام کا بھتیجہ (بھتیجا) کہتے تھے۔ باپ کا نام کوئی نہ لیتا تھا۔ کرسی وار مونڈھے پر کمر لگا کر بیٹھے ہوئے، پاؤں سامنے والے بے کرسی مونڈھے پہ پھیلائے وہ یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

ہے سواری کو یہ لازم صبر کرنا چاہیئے
ٹھہر جائے جب یہ گاڑی تب اترنا چاہیئے

یہ شعر کسی کرایہ کی بس پر لکھے ہوئے ہوں گے

خواہ تھانیدار رہے یا ضلع افسر یہ ان کے ساتھ اس طرح ٹانگ اکڑا کر چلتا تھا جس طرح فوجی افسر کسی بڑی ہستی کو گارڈ آف آنر کا ملاحظہ کراتے

ہوئے چلا کرتے ہیں اور پیٹ سکوڑ لیتا تھا ایک مرتبہ بسوڑوں میں بارات آئی جس کے بھنڈیلے گھاسی رام کی نقل کرتے ہوئے کبھی مونڈھے پر بیٹھتے کبھی جوتوں کو اڑیاں مارتے۔ کبھی پیٹ سکوڑ کر ٹانگیں اکڑا کر چلتے۔ اس کا پتہ کسی نے گھاسی کو بھی دیدیا۔ اس نے بھری محفل میں آکر بھنڈیلوں کو گالیاں دی تھیں اور جوتے مارے تھے اس سے اتنی سڑبڑی مچی تھی کہ بھنڈیلے اپنے ڈھول اور ہارمونیم چھوڑ کر بھاگ گئے اور آئندہ کوئی بھی بھنڈیلا اس گاؤں میں نہیں آتا تھا۔

گھاسی رام کی سختیاں انسانوں تک ہی محدود نہیں تھیں ان کی لپیٹ میں مویشی تک آ گئے تھے اس کی بھینس نے جب دودھ دیتے ہوئے تنگ کیا تو اس نے دودھ پیتا کٹڑا تو قصائیوں کے ہاتھ بیچ دیا اور بھینس کو بچاندطر بنا کر ہلوں میں جوتی تھی۔

ادھر ترلوکی کا دادا بھی ہرنام کے گھرانے کی طرح ہی سرمایہ دار تھا لیکن اس نے اپنی کل زمین شراب اور عورت کی علت میں ختم کر دی تھی۔ ترلوکی کا باپ اب لاوا، بھوکیا، بیلدار اور نرائی کرنے والا رہ گیا تھا۔ ان کے گھر کو ڈھک د ئی میں اب بھی محل کہتے تھے حالانکہ یہ محل بھانوے نما کھوری اینٹوں کا ایک منزل مکان تھا اس کی چنائی گارے سے ہوئی تھی، اندرونی اور بیرونی فرش خام تھے۔ اور چھتیں بھی کچی۔ جن پر برسات میں عدم خبرگیری کی وجہ سے ہریالی کا بن پھیل جاتا تھا اور یہ ٹپکتی تھیں۔ پھر ترلوکی کا باپ کھرپے کے ساتھ ان پر سے گھاس چھیلتا اور مٹی ڈال کر تھپکے سے تھپکتا۔ اکثر دفعہ جب کہ بارش کی آمد آمد

ہوتی اور ہمالہ سے اٹھا ہوا بے تحاشا بادل شمال کی جانب پھیلے ہوئے پیلو، کریر اور تیندو کے جنگل پر سے گرجتا ہوا آتا ہوتا تو ترلوکی بھی مٹی پڑی چھت پر چھپکا چلاتی ہوئی دکھائی دیتی اور گلیارے میں چلنے والے اوپر نظر کرتے تو اس کا چہرہ انہیں تازہ گگوں ٹیلے ایسا معلوم ہوتا۔

تو جب ترلوکی نے اس کی نیلی سی دھوتی میں سے کھلی ہوئی ہوشکی ہوئی پنڈلیوں کی طرف آنکھ دبا کر تک چڑھے پن اور سیاہ چشمی سے دیکھتے ہوئے جھبڑی کو ہرنام کی طرف چھچکارا تو ہرنام نے اس کی بڑی پیوندی جامن ایسی تیرہ وتار پتلیوں کی طرف دیکھا جن پر وہ گوبند باغ وار سکتا تھا لیکن گالی دیتے ہوئے بولا " ڈُرت تیری، کتیا نوں میرے پاچھے کیا چھچکار رہے ہے۔ آپ بھونکتی ہوئی پاچھے ہولے۔ جو تیں مجھے پکڑ لیا تو میں تیرا بندھوا ہو جاؤں گا پر تیں میری سہرے ڈولے کی بیاہتا نہیں ہوگی۔ میں تجھے اس طرح راکھوں گا جس طرح تیرے دادا نے منگنی بنجارن راکھی تھی جسے وہ وہاں سے بھگا کے لایا تھا۔ جو میں نہ پکڑا گیا تو میری مرجی تجھے جتنا چاہوں تو دل بھانجوں۔"

ریڑے کے پاس آکر جہاں پیر پڑے ہوئے تھے گاؤں سے فرش والے گھاٹ پر جانے والا گونڈا اتنا تنگ ہو گیا تھا کہ صرف ایک بیل گاڑی نکل سکے۔ جو کہیں دو گاڑیاں آمنے سامنے سے آجاتیں تو ان میں سے ایک کو کافی پیچھے لے جایا جا کر گذرگاہ پیدا کی جاتی۔ یہاں دو طرف اونچی مینڈھوں پر بانسا اور مالھا کھڑا ہوا تھا اور راستے میں کوڑیالے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔

جب نرلو کی یہاں پہنچی تو سرنام نے پیچھے سے آتے ہوئے کہا: "نچ پنچ"

"ٹٹو پہ چڑھ کے جادہ مروڑ مان نا آرے نکھد۔"

"نکھد ہو گی تیں۔ ہور (اور) یہ ٹٹو نی (نہیں)، مہاری کدم باج ٹرنگ گھوڑی ہے۔"

"ٹٹو ٹرنگ نی ہوتی۔"

جدھی (جب ہی) تو کدم باج گھوڑی نوں ٹھہراتک ناہیں مڑا۔ دھانی باندھو لیے پھر رہے ہے۔ ہور..... تیرے پیر دھرتی نوں پچکارتے جا رہے ہیں۔"

"تیں چاہتی ہو گی، یں تجھے پچکاروں، پر وہ پچکارنا جد ایک بات نہ ہوئی ہوتی۔"

"تیں ٹٹو پہ چڑھا تھا، میرے سے پہلوں (پہلے) چلا تھا۔ پھر پاچھے کیوں رہ گیا؟"

"جی ماں میلا نی تھی ہو ٹٹو ہی تو ہے ہیج ہیج ٹولتی ہوئی چلی ہے۔ تیں یونی پوچھتی وہ (وہ) کیا بات تھی۔ جو وہ نہ ہوئی ہوتی تو میں تجھے ضرور پچکارتا۔ تیں دھوے رائے نوں جانے ہے۔"

"دھوے رائے کون؟"

"چودھولا ہے، چوکیدار کا پوت۔ تیں (تو) اس سے ملی ہوئی ہے۔"

یہ سنتے ہی نرلو کی کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا لمبی دھار بول

والا چست سا پاجامہ اور بیگنی رنگ کی کرتی پیڑ سے اتار لی ہو اور وہ ننگی بچی کھڑی رہ گئی تھی۔ اس نے کئی کوڑیالے پتھر اٹھا اٹھا کر سرنام کے مارے۔ وہ ان پتھروں کا جواب صرف ان الفاظ سے دے رہا تھا کہ "للیتا جی تیری پربھا سدا بنی رہے اتنی تنی نہ ہو، اتنی تنی نہ ہو۔ منہ اُمولال انگاری بنا لیا ہے۔ کہیں کپڑوں ما آگ نہ لگ جا۔ مرجاؤگی مر۔ ترلو کی پھر جیبری نو پچھکارتے ہوئے کنکھیوں سے کون دیکھا کرے گی"۔ ان پتھروں میں سے ایک پتھر گھوڑی کی آنکھ میں جا لگا۔ جوانی بدہ کی کہ دھانٹی کھل گئی اور سرنام سر کے بل گرا اس کے سر میں پتھر کی دھاردار نوک چبھ گئی۔ چہرہ خون سے تر بہ تر ہو گیا اسے بے ہوشی طاری ہو گئی۔

جب شوقی گھوڑی کھٹ کھٹ کرتی ہوئی طویلہ پہنچی تو سرنام کا تایا کرسی دار مونڈھے پر جھومتا ہوا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس نے پاؤں پلا کرسی کے مونڈھے پر رکھے ہوئے تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ گھوڑی کا سر پاؤں میں گھستا آرہا ہے اور آنکھ بھی پھوٹ گئی ہے تو گھوڑی کو تھان پر باندھ کر وہ طویلہ کی ڈیوڑھی کی طرف چلا۔ جبھی چوکیدار کے لڑکے نے جلدی جلدی اور گھبراہٹ میں آکر کہا کہ سرنام ریڑے کے پاس مرا ہوا پڑا ہے۔

ترلو کی کپلا گائے کو پلا پانی پلائے ہوئے واپس لے آئی۔ رپانی کی کوکھ خالی دیکھ کر اس کا باپ جھنجھلایا تو وہ سہمی ہوئی اپنی ماں کے پاس جا کر بُری طرح رونے لگی۔ اس کی ماں نے اسے پیار کرتے ہوئے بہت پوچھنا چاہا کہ کیوں رو رہی ہے لیکن وہ بولتی ہی نہیں تھی بس روتی جاتی تھی۔ ذرا

دیر بعد اس نے ہچکی لیتے ہوئے کہا کہ ہرنام نے مجھے گال (گالی) دی ہے۔ اور آگے نہیں بتلائی۔ اس کی ماں سمجھی کہ ہرنام نے ترلوکی کی عزت پر حملہ کیا ہے' اس لئے وہ بھی روتی ہوئی اپنے خاوند کے پاس گئی اور اسے اتنا اکسایا کہ وہ اپنے کچھ ہمدردوں کو ساتھ لیکر ہرنام کے تایا پر چڑھنے والا تھا ترلوکی کے باپ نے کلہاڑی اٹھائی ہوئی تھی اور دوسرے ہمدردوں کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ وہ ابھی تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ ہرنام کو چارپائی پر پڑلئے ہوئے لا رہے ہیں اور اس کا باپ اور ماں رو رہے ہیں۔ ہرنام کا تایا چھتری لگائے اس کرائے دم اور بے پروائی سے چل رہا تھا جیسے ریڈ کراس والے کسی زخمی سپاہی کو محاذ سے اٹھا کر لا رہے ہوں۔ انتقامی جماعت چپکے سے واپس آگئی۔

ترلوکی نے تفصیل کے ساتھ کچھ نہ بتایا تھا صرف یہی کہا تھا کہ اُسے گالی دی ہے اس لئے معاملہ کی تہہ کو کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔ ترلوکی کی ماں نے اس استفہامیہ کا جواب کہ گالی دینے کے بعد معاملہ کہاں تک پہنچا اپنی طبیعت سے پیدا کر لیا تھا کہ ہرنام نے ترلوکی کی عزت پر حملہ کیا ہے ترلوکی کے باپ نے اپنی لڑکی سے ہرنام کے پیچھے کتیا کو چھچھکارتے ہوئے کچھ سن لیا تھا اس لئے وہ یہ سمجھا کہ آخر ترلوکی کو اس طرح کرنے کی کیا حاجت تھی اور اگر ہرنام نے اسے گالی دی تو اس میں ترلوکی کا بھی قصور تھا اور عزت پر حملہ کرنے کا قصہ ایک فضول طوبار ہے۔ وہ ٹھنڈا ہو گیا اور سہولیت میں آ کر گائے کو تسلے میں پانی پلانے لگا۔

۲

قصبہ مہوریہ کے چھوٹے تحصیلی ہسپتال سے ڈاکٹر کوئی نصف شب پہنچا۔ ہرنام کو ابھی تک غشی طاری تھی۔ اس کے دماغ کو اتنا صدمہ عظیم پہنچا تھا کہ اس کے جینے کی امیدیں ہی سی اٹکی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اس کی مرہم پٹی کرکے چلا گیا اور دوائی بھی دے دی جو اس کا منہ کھول کر مشکل سے حلق تک پہنچائی گئی۔ وہ اگلے دن بھی بے ہوش پڑا رہا اور ڈاکٹر اب تک اس کی زندگی کی بابت کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ آج مہوریہ سے سلوتری بھی آیا تھا جس نے آخری فیصلہ یہ دیا تھا کہ گھوڑی کی آنکھ ٹھیک ہو ہی نہیں سکتی۔ چوتھائی رات گئے ہرنام نے پانی مانگا تو ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق کچھ آس سی بندھ گئی۔ پھر اس نے خود ہی بلا پوچھے اٹکتے ہوئے کہا کہ اس کی گھوڑی ریڑے کے نزدیک، تہ لوکی کی کتیا نے بھڑکائی تھی، جس کی وجہ سے وہ تلے گر گیا۔ یہ کہتے ہی اس پر پہلے سے بھی زیادہ غشی طاری ہو گئی اور وہ پانی بھی پی نہ سکا۔

یہ سن کر کہ اس کے بھتیجے کی تکلیف کا باعث کتیا ہے اور اس کی وجہ سے اُن کی قدم باز گھوڑی یک چشم رہ جائے گی، ہرنام کے تایا کو سخت غصہ آیا۔ وہ اپنے بستر کی موٹی اور شام پلائی لٹھیا کہ سنگین چڑھی رائفل کی طرح لے کر دوڑا۔ ترلوکی کی ڈیوڑھی کے کواڑ بند تھے اور اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ وہ جا کر کواڑ دھڑا دھڑ ہلانے لگا۔ رسہ دری کے آگے گر۔ گلی والے ادھر

سے ذرا دور بیڑھے میں بیچ والے پلنگ پر نرلوکی اور دونوں جانب والی چارپائیوں پر اس کی ماں اور باپ سو رہے تھے ۔ دیہات میں کنواری لڑکیوں کی حفاظت کے لئے اسی طرح بیچ میں سلانے کا رواج ہے ۔ کواڑوں کے پیٹے جانے پر تینوں جاگ گئے ۔ کُتیا جو جھبڑی ہوئی تھی بھونک بھونک کر باؤلی ہوئی جا رہی تھی ۔ نرلوکی کے دروازے پر آدھا گاؤں جمع تھا ۔ نرلوکی اور اس کے ماں باپ ضیق میں تھے لیکن وہ دروازہ نہ کھولتے تھے ۔ نرلوکی جان بچانے کے لئے کوٹھے پر چڑھ گئی ۔ اسے ڈر تھا کہ سرنام نے اسے بتا دیا ہے گھوڑی کی آنکھ اس نے پھوڑی جس سے وہ سر کے بل تلے آ رہا ۔ وہ کوٹھے پر چھپی ہوئی سرنام کے تایا اور مجمع کو اس طرح دیکھ رہی تھی جس طرح غدر ۱۸۵۷ء کے دنوں میں محاصرہ شدہ انگریز لکھنؤ ریذیڈنسی سے حملہ آور بلوائیوں کو بصد ہراس دیکھ رہے ہوں ۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا ورنہ دیکھنے والے دیکھتے کہ اس کی پتلیاں ان کالی کھجوروں سے بھی اول تھیں جو ہواؤں میں لہراتی ہوئی ہری ہری نئی نئی ہوئیں شاخوں کے تلے گچھوں میں لٹک رہی ہوں ۔

آخر جب دروازہ بھونچالی حالت میں آ کر گرنے ہی لگا تو نرلوکی کے باپ نے کنڈی کھول دی ۔ کُتیا سرنام کے تایا کو دیکھ کر بھاگی ۔ سابق فوجی مٹھیا لئے فوجی طریقہ پر اس کے خلاف جارحانہ کارروائی کرتا ہوا تعاقب کرنے لگا ۔ نرلوکی کوٹھے کے اوپر سے چھپے ہوئے اور سہمے ہوئے اور اس کے ماں باپ نیچے کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے ۔ ان میں

سے کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ اسے روک سکیں۔ وہ بلا سبب بتائے کتیا کا تعاقب کر رہا تھا پھر اس نے اپنی فوجی اُپج دکھاتے ہوئے گھیرا دے کر دوپہریئے کے پھولوں کے پاس عاجز کر لیا اور لٹھیا سے بے دردی کے ساتھ اسے مار مار کر اس کے پران چھڑا دیئے۔ وہ اس کے سنگین کی طرح کھودیں مار رہا تھا۔ پہلے جھبری کی دونوں آنکھیں پھوڑ دی گئی تھیں۔ ہرنام کے تایا نے محض غصہ میں آکر بلا ضرورت ہی سہ دری کے تینوں ستونوں کے پاس کھڑے ہوئے دوپہریئے کے پودوں کو لاٹھیاں مار مار کر توڑ دیا تھا۔ اور انہیں اٹھا اٹھا کر زور زور سے ادھر ادھر پھینکا تھا۔ کئی پودے اس نے کوٹھے پر بھی پھینکے تھے۔ اس نے گھڑونچی پر رکھے ہوئے تمام گھڑوں کو بھی ٹھینکرا ٹھینکرا کر دیا تھا۔ چلتے ہوئے اس نے تنسی کا گملا بھی لاٹھی سے پھوڑ کر ٹھینکرے اور مٹی ادھر ادھر بکھیر دی تھی۔ جب ترلوکی کے باپ کو پتہ چلا کہ ہرنام نے چند لمحہ ہوش آنے پر یہ کہا تھا کہ گھوڑی کو کتیا نے پھر کاٹی تھی تو وہ گنگا کی قسم کھا کر مجمع کو یقین دلانے لگا کہ کتیا تو بندھی ہوئی تھی۔ ترلوکی نے ڈر کے مارے اصلی واقع کو پوشیدہ رکھا لیکن اب ترلوکی کی دھڑکی ختم ہو کر جان میں جان آ گئی تھی۔

مجمع چلا گیا تو تینوں گھر والے پھر اپنے بستروں میں آ لیٹے۔ ترلوکی کہہ رہی تھی کہ بھگوان کرے وہ بھی مر جائے جس نے اس کی کتیا کو مروایا ہے اور دوپہریئے تڑوا دیئے ہیں۔ پھر ہرنام کے گھر سے عورتوں کے رونے کی آواز آنے لگی۔ اس وقت ہرنام کی دونوں بہنیں اپنے سسرال سے بلائی

کو دیکھنے آئی تھیں اور وہ سرنام کو بُری حالت میں دیکھ کر رو رہی تھیں۔ ترلوکی کو خیال ہو گیا کہ اس کی دعا قبول ہو گئی ہے اور سرنام کا خاتمہ ہو گیا۔ اسے کچھ خوشی سی ہونے لگی پھر اسے نیلی دھوتی میں سے کھلی ہوئی خاکستری پنڈلیاں یاد آ گئیں، جو گیتوں والی مچھی کی پنڈلیوں کی طرح گول گول تھیں۔ اب اسے یہ خیال آیا کہ اس کی گھوڑی کی آنکھ تو میں نے ہی پھوڑی ہے اور میرے ہی پتھر پھینکنے پر گھوڑی بھڑکی تو وہ گرا تھا تو اس نے مجھے ذلیل و خوار کرنے کو کتیا کہا۔ اسے مجھ سے سخت نفرت ہو گی۔ اس کی پنڈلیاں گیتوں والی مچھی "الیسی تھیں تو کیا؟ اس نے مجھے گالی تک دی تھی مجھ پر چوکیدار کے لڑکے کے ساتھ ملی ہوئی ہونے کا الزام بے جا لگایا تھا۔

یہ غم و غصہ اور نفرت کے خیالات پچھلی رات تک اس کے دل میں جاگزیں رہے لیکن پھر اس کے دل میں یہ بات بھی آنے لگی کہ شاید اسے مجھ سے کہیں پیار نہ ہو جو اس نے میرا نام نہیں لیا۔ جو وہ میرا نام لے لیتا تو اس کا تایا مجھے بھی بھیڑ کی طرح مار سکتا تھا۔ خون کا بدلہ خون ہے، وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اس پر پتھراؤ تو ہو رہا تھا لیکن وہ اس کا جواب ان الفاظ سے دے رہا تھا کہ "للیتا جی! تیری پرچھا سدا اپنی رہے اتنی تتی نہ ہو۔ مکھڑا لال انگاری بنا لیا ہے۔ کہیں کپڑوں ماں آگ نہ لگ جائے۔"

پھر ایک زبردست کشمکش جاری ہو گئی۔ اسے مجھ سے نفرت تھی؟ اسے مجھ سے پیار تھا؛ اور اس کی پنڈلیاں گیتوں والی مچھی "الیسی گول گول تھیں۔ جوں جوں رات گذرتی گئی اسی تناسب سے یہ خیال تقویت پکڑتا گیا

کہ اسے مجھ سے محبت تھی، جیسے کسی پیالے میں متقطر پانی ٹپکے ٹپکے پڑ کے پیالہ لبریز ہو جائے صبح صادق کے وقت ترلو کی کے دل میں یہ خیال پورا استحکام پکڑ گیا تھا کہ ہر نام کو اس سے پیار تھا۔ اور وردمندی پیدا ہو کر دل باختگی بڑھ گئی۔ اب وہ بستر میں نہیں لیٹ سکتی تھی۔

جس طرح کپل وستو کا شہزادہ رات کے وقت اپنے بیوی بچوں کو سوتا ہوا چھوڑ کر نکل گیا تھا ترلو کی اپنے ماں باپ کو بستر میں محو شکر خواب چھوڑ کر گھر والوں کے پاس شوالے میں پہنچی۔ اس وقت شوالے کے گنبد پر کلس کے نیچے بار بار دُم نیچے اوپر کرنے والی کالی چڑی بیٹھی ہوئی کہروا گا رہی تھی اور سدا سہاگن کا جوڑا بغیا میں کھیل کھلاڑیاں کرتا کرتا بولتا، کبھی اس شاخ پر اڑ کر بیٹھ رہا تھا کبھی اس پر، اندر گھنٹے بج رہے تھے اور منی گھنشیام داس سنکھ بجا رہا تھا۔ کچھ عرصہ کے لئے ترلو کی مندر کے عقبی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو کر سدا سہاگن کے جوڑے کی خوش مستیاں دیکھنے لگی، اسے خیال آ رہے تھے...... ہیرا اور اس کا بھی خوب سا جوڑا ہے جس کی پنڈلیاں گیتوں والی چھتی ایسی ہیں۔ ہم دونوں بھی انہیں پنچھیوں کی مانند ہیں۔ میں کھلاڑی ہوں وہ کھلاڑی پر یہ بغیا ہمارے لئے کم ہے۔ ہم تو نہر پار کھڑے ہوئے باغ میں کھیل کھلاڑیاں کرتے، اڑتے، بولتے، اڑتے پھرتے۔

ترلو کی دو طرفہ کھڑے ہوئے کیلوں کے درمیان روش سے ہوتی ہوئی پھلواڑی کی طرف گئی جہاں گل تسبیح اور کنیر کے سرخ، زرد اور آسمانی پھول کھلے ہوئے تھے اس نے ایک سرخ کنیر کی جڑ کھرپی سے اکھاڑی

اور مچھلی بھون کے پانی میں دھو کر کھالی ۔ کنیر کی جڑ میں زہر ہوتا ہے ۔ جب ہرنام ہی دنیا میں نہیں جس کی ہلاکت کی بانی وہ تھی تو پھر ترلوکی کیوں زندہ ہے ۔ کنیر کی جڑ کھا کر وہ دوڑی دوڑی اپنے گھر پہنچی ۔ اس کے ماں باپ ابھی سو رہے تھے ۔ وہ بھی نیچ والے بستر میں سو گئی ۔

پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہولیں اٹھ رہی ہوں اور اس کے دل و جگر کو سہلاتے ہوئے اجگر ڈس رہے تھے ۔ وہ تکلیف میں بُری طرح تڑپ رہی تھی ۔ اس کے ماں باپ کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ماجرا ہے ہرنام ابھی تک زندہ تھا ۔ قصبہ مہوریہ کے ڈاکٹر نے جو دن چڑھے پہنچا آج یہ مژدہ سنایا کہ وہ خطرے سے باہر ہے اور ڈاکٹر کے بیٹھے بیٹھے ہی اسے ہوش آ گئے ۔ جبھی سارے گاؤں میں اڑتی اڑتی یہ خبر ہرنام کے کانوں تک بھی پہنچ گئی کہ ترلوکی مر رہی ہے مگر خبر نہیں کیوں ؟ اس کی بیماری کا علم نہیں تھا ۔

جب ڈاکٹر ہرنام کے زنان خانے کی ڈیوڑھی سے باہر نکلا تو اس کے ساتھ ہرنام کا تایا بھی تھا ۔ اس کی چال فوجی تھی ۔ وہ تھوڑا سا سینہ نکال کر کچھ کچھ ہاتھ جھٹک رہا تھا ۔ رہلو میں بیٹھنے کے ساتھ ہی ترلوکی کے باپ نے ڈاکٹر سے کہا کہ وہ اس کی لڑکی کو دیکھ لے ۔ ہرنام کا تایا حسب عادت اپنی ناگوار چودھرائی اور نمبرداری جتاتے ہوئے مصر تھا کہ ڈاکٹر ہرنام کو دیکھنے آیا ہے فیس انہوں نے دی ہے دوسرے کے گھر میں مفت کیوں جائے ۔ لیکن ڈاکٹر نے یہ بات یوں مسترد کر دی کہ اس کے لئے قانوناً لازم ہے کہ ایسے مریض کو ضرور طبّی امداد بہم پہنچائے ۔ ہرنام کا تایا بلا سلام مجرا اُٹھ کے غیر رسمی

طریقے پر رخصت ہو گیا۔

ڈاکٹر نے فوراً تشخیص کر لی کہ ترلو کی پر زہر کا اثر ہے اور اسے دوا دینی شروع کر دی۔ جو یہ تھوڑی دیر تک نہ پہنچتا تو ترلو کی ہو لی ہوتی، لیکن وہ ابھی تک موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس کے لئے جلد از جلد تحصیلی ہسپتال سے دوا لانے کا انتظام ہونا چاہیے تھا۔ ترلو کی کا باپ ڈاکٹر کے ساتھ ہی ہو گیا گو رہلو میں کافی جگہ تھی۔ وہاں اکیلا ڈاکٹر ہی تو بیٹھا تھا لیکن سرنام کے تایا نے ترلو کی کے باپ کو بیٹھنے کی اجازت نہ دی حالانکہ وہ اس کے گوڑ تک پڑا تھا اور ڈاکٹر نے بھی سفارش کی تھی۔ وہ خود رہلو میں بیٹھ کر شماتت کے ساتھ رہلوبان کو تقاضہ کرنے لگا کہ رہلو تیز چلائے تاکہ ترلو کی کا باپ پیچھے پیچھے گرد و غبار میں اٹا بھاگتا آئے۔ وہ گاؤں کے نکاس سے ہی رہلو کے پیچھے پیچھے بھاگا جا رہا تھا۔ اور سرنام کے تایا کی اپنی کارگذاری پر باچھیں سی کھلی جا رہی تھیں۔ رہلوبان کو پیچھے ڈاکٹر کے پاس بٹھا کر اس نے پینی خود سنبھال لی تھی اور بیلوں کا مار مار کر ناس کر دیا تھا۔

۳

گو ترلو کی اور سرنام خطرے سے باہر ہو گئے تھے لیکن انہیں تو اب پریم کا جنم روگ لگ گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے الگ الگ اپنے اپنے گھروں میں بیماری کے بستروں میں پڑے ہوئے ایک دوسرے کو یاد کرنے لگے

جس طرح ملاح کو اپنی کشتی کا پتوار لنگر اور دنیا لا نہیں بھولتا اسی طرح سے انہیں ایک دوسرے کے نقشے نہیں بھولتے تھے۔ ترلوکی کو نیلی سی دھوتی سے وہ گول گول پنڈلیاں ہر وقت یاد رہنے لگی تھیں۔ جو گیتوں والی "مچھی" کی پنڈلیوں ایسی گول گول تھیں۔ ہرنام کے ذہن میں ہر وقت وہ صفا کش نظر نواز اور درشتی کمھڑا رہتے لگا تھا جس کے سفید موتی ایسے آبدار رخساروں کے پاس بڑی پیوستی جامن ایسی تیرہ تار پلکیوں والی دو کھلواں کھلواں آنکھیں تھیں۔ ترلوکی کے اعصاب پر ہر وقت ہرنام طاری تھا اور ہرنام کے اعصاب پر ترلوکی۔ ہرنام اس کے تلف و ضیاع پر تلا ہوا تھا۔ اس کے دل میں ترلوکی سے ملتے ہی اس کا سینہ ملیا گداز اجھیل جینے کی تھی اور جس طرح کپلا گائے کا سیانا الوارالقس جو بھنکتے وقت گوڈے ٹیک ٹیک کر دم اٹھا کر زیادہ دودھ پینے کی خاطر بالھڑی میں جھٹکے سے مارا کرتا ہے، ہرنام بھی اس کے ساتھ اسی طرح سے پیش آتا۔ ایک دوسرے کے شوق ملاقات نے انہیں جلد صحت یاب کر دیا۔ ہالہ کے سیر سبز دار کھیتوں پر ٹھنڈ دن آتی کٹی ساون کی ہوا اور بھوار میں بھی اتنی مگن ہو کر نہ لہرائی ہو گی جتنی اس لڑکی کو ہرنام سے ملنے کی خوشی ہو دالی تھی۔

ہرنام کو ان دنوں ایک یاد آ رہی تھی یہ یاد اسے پہلے کبھی نہ آئی تھی۔ پیڑیوں والے گھاٹ سے اصل نہر کی چھوٹی سی راج باہے نما دھار الگ ہو کر مشرق کی طرف بہتی ہوئی ٹاپو سا بنا کہ فرش والے گھاٹ پر اصل نہر سے جا ملی ہے پچھلی گرمیوں میں آج کل اس ٹاپو کے ٹھرکزن میں لڑکیاں آہنی جالیں لگا کر مچھلیاں پکڑ رہی تھیں۔ یہ محض شوق کی خاطر تھا۔ مچھلیاں کھانے کے لئے نہ تھیں

انہیں لڑکیوں میں ترلوکی بھی تھی۔ اس کھیل سے فارغ ہو کر باقی لڑکیاں جو پیڑیوں والے گھاٹ کی طرف رہتی تھیں وہ تو پیڑیوں والے گھاٹ کی طرف چل دیں مگر ترلوکی جس کا گھر ریڑے کی طرف تھا وہ ریڑے کے سامنے ہی شاخ نہر کو عبور کرنے لگی۔ پچھلے سال یہاں صرف گھٹنوں گھٹنوں پانی تھا لیکن اب یہاں کنڈی پڑ گئی تھی اور نہر بھی لبالب چل رہی تھی کیونکہ سخت دھوپ کے سبب پہاڑوں کا برف خوب پگھل رہا تھا۔ اس لئے ترلوکی ڈوب گئی اور اسے ہرنام نے باہر نکالا جو نہانے کے لئے کپڑے اتار رہا تھا۔

ترلوکی کا پنڈا جو ہرنام کے بدن سے اس وقت لگا تھا جبکہ وہ اسے اٹھا کر ڈوب والے ہرے کنارے پر ڈالنے کے لئے لایا تھا۔ اسے وہ جس یاد آ رہی تھی اور ترلوکی کا ٹھنڈے ہونٹ کھولے ہوئے بے سُدھ چت لیٹنا۔ پھر اس نے ترلوکی کو اوندھی لٹا دی تھی تاکہ پیٹ سے پانی نکل سکے۔ بھیگ کر چمٹی ہوئی کرتی میں سے اس کے جسم کی شوبھا کیسی چور کو مات کر رہی تھی۔

اب ترلوکی چوکیدار کی معافی ملک میں سے ہوتی ہوئی گھر جانے لگی۔ یہ ملک کنڈی کے پاس تھی اور اس میں چار طرف ارنڈ کی باڑ تھی جس میں بن تمیتر رہا کرتے تھے۔ جب ترلوکی رکھوالے کی جھونپڑی کے پاس سے گزرنے لگی تو اسے چکر آ گئے۔ اس لئے وہ اندر جا کر زمین پر لیٹ گئی۔ چوکیدار کا گورا گورا پٹھا سا پوت پاس چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اس نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس کے بھیگے ہوئے کپڑے مٹی میں خراب ہو جائیں گے اسے چارپائی

پر لاڈالا۔ پھر اس کے دل میں بدی آگئی اور وہ اسے چنگا بنانے ہی والا تھا کہ ہرنام کے بیٹے تایا نے آکر لاٹھی سے اس کی ٹوکری میں کھود ماری۔ چوکیدار کا گورا لاڈکا بھاگ پڑا۔ بچنیا بھی اس کے پیچھے شور مچاتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ شام سے پہلے پہلے یہ پوری داستان سارے گاؤں میں پھیل گئی اور سب لوگ چوکیدار کے گورے لڑکے کو گالیاں دے رہے تھے۔ کوئی کوئی یہ بھی کہہ رہا تھا کہ دھولے راؤ نے داؤ تو پہلے ہی مار لیا ہوگا۔ ایک دو کھو بھی کھالی تو پھر بھی گھاٹے میں نہیں رہا۔ کیونکہ چوکیدار کا لڑکا گورا تھا اس لئے نفرت کھا کر اسے دھولے راؤ کہہ رہے تھے۔ ریڑھے کے پاس گونڈے میں جو ہرنام نے ترلوکی کو چوکیدار کے لڑکے سے ملی ہوئی ہونے کا چرکا دیا تھا تو اس کی اساس بھی اس واقعے پر موقوف تھی۔

ایک شب جب کیکروں والے ریڑھے سے بیر اٹھ چکے تھے اور ان کا بچا کھچا دانہ دنکا جنگلی کبوتر اور دوسرے پرندوں نے چُگ لیا تھا۔ لوکاٹوں اور شہتوت کی بہار ختم ہو چکی تھی۔ خربوزے، تربوز اور اگیتا آم چل رہا تھا۔ چاندنی سی رات تھی لیکن کٹاری چاند گرد و غبار میں ایسا آیا ہوا تھا جیسے ڈھیری کی چھتی میں چراغ جل رہا ہو۔ تارہ ایک بھی نہیں تھا۔ بہت ہلکی گرم ہوا چل بھی تھی۔ اتر کی سمت دور دور پھیلے ہوئے بیلو، کریر اور تیندو کے جنگل میں گیدڑ اور لگڑ بھگے بول رہے تھے۔ کنڈی کے پاس والی ہلک میں چوکیدار کا لڑکا دائرے پر گا رہا تھا۔

میرے من کا بیتو یا سہر گیاری سہر گیاری

میرے من کا لیتو با سہر گیا ری سہر گیا ری
دُکھ کا دڈیا سہر گیا۔ ری سہر گیا ری
دُکھ کا دَدیا سہر گیا ری سہر گیا ری
گاں رگاؤں کارھو با سہر گیا ری اہر گیا رکا

قیصہ مہوریہ کی طرف سے جدھر گاؤں کا ادسرا ادرآجڑا علاقہ پڑا ہوا ہے۔ ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے غول بیابانی واویلا کر رہے ہوں تو ڈھک دنی کے دو دوداسی اس طرح گفتگو کر رہے تھے:

"اے ہرنامے! تیں مر ہی جاتا تو اچھا تھا"

"تر لوکی جیتی رہتی تو اچھا تھا"

"کیوں رے کیوں ہرنامے؟"

"کوئی مہارا بھی تو یاد کرن والا ہوتا"

"تیرے ماتا پتا ہور کٹم والے مر گئے تھے جو ترلوکی تجھے یاد کرتی رے ہرنامے؟"

"جس طرح میں تمیں یاد کرتی، وہ یاد نہ کرتے۔ تیں تو مجھے کدھی بھی نہ بھولتی۔"

"میرا بیاہ ہو جاتا تو بھول جاتی۔"

"تیں بیاہ ہی نہ کرواتی۔"

"جو میرے ماں باپ کر دیتے۔"

"وہ بیاہ ہوناہی نہ۔"

"ہور کیا ہوتا رے سرنامے ۔"

"ہوتا جو ہوتا ۔ تجھے ذانوری ماں باندھ جوڑ کے لے جاتے تو یا تو تیں جد مالک کے گھر جاتی یا گھاس کی جالی میں باندھ کے لے جاتے جب جاتی ویسے نہ جاتی ۔"

"(ہنستے ہوئے) کیوں رے سرنامے گھاس کی جالی ماں کیوں ؟"

"ناج کے بورے ماں لے جاتے تو دم گھٹ جاتا جالی دار بورے ماں سانس تو لیتی رہتی ۔"

"جا رے جا سرنامے ۔"

"تیں بی چل ندی پا چلیں گے ۔"

"وہاں جا کے سرنا ماڈوبے گا ؟"

"ڈوبا تو تیں لگے ہے ۔ یں تو تجھے تونبی کی طرحاں کدھی اس بغل ماں دبا ؤں گا کدھی اس ماں ، کدھی چھاتی تلے ہور کنڈلیاں مارتے ہوئے پانی ماں تجھے لیئوں کھوب تیرتا پھروں گا ۔"

"میں سرنامے کی بگل سے اس طرحاں نکل جاؤں گی جس طرحاں اہمیا کی مچھلی چٹکی سے پھسل کے وو جا وو جا"

"تیں کس طرحاں بولے ہے ۔"

اس طرحاں بولے ہے اک رگڑ) تجھے یوں بولتی ہوئی دیکھ کر میرا جی چاہن لگا تجھے اسی وکھت جھبو جھبو جھبوٹے دیئی لگوں"

"چپ چپ رے تجھے اب میں تجھے چیر تناتیا کہا ۔ ۔ ۔ ۔ ہوریاتی اٹھنگ

بڑھنگ نہ ہانک نہیں تو پھر پھڑاکا ہو جاگا ۔ للیتاجی پھر اسی دن کی طرداں گُسے ملن بھر جاگی ہے

" کسی کا کیا نکسان (نقصان) ہوگا للیتاجی نے تتی ہو کے مو (مُنہ) لال انگاری بنایا تو اس کے کپڑوں ماں آگ لگ جاگی ۔ اچھا تیں جہر (زہر) کیوں کھایا تھا بتا ؟ "

" تیں بے مار (بیمار) کیوں ہوا تھا رے مرنا مے تیا ؟ "

" تیں پتھر پھینک کے مارے تھے ۔ گھوڑی بدکا دی تھی میں گر گیا تھا "

" تیں کچا سو اہے مرنا مے !

" للیتاجی ! بھلا جد پانیتے وارے دِن چکہ بدان باچوکھے مجرے کے تیے کھیڑا انبھگان کے پٹھان ۔ رانگھڑ طوالے کے رجپوت ' مدنی پور کے سید کھونٹے چھاڑنے نوں اپنے اپنے چیتواں گھوڑاں پر آئے تھے تو سب سے جادہ کھونٹے کس نے پھاڑے تھے ' ہو رنبو پہلوان کے مونڈھے (بازو) پہ بیٹھ کے کس نکھتری کا جھلوس نکلا تھا ؟ "

" تیرا ، تیرا ، تیرا ، تیرا ، رے ڈینگیے تیرا ، تیں تو رلیو دھن ہوہ تیج ونت ہوے ۔ پر اس دِن میرا جی بہت دہلا تھا ۔ "

" کیوں ؟ "

" میں مجھے ہاتھ لپک سا دیکھے تھا ۔ کچھ گُنگنا کنکتا سا ڈھیلر ڈھیلر بُربُر ابھر بھرا ہیں بجھوں نتھی بچو کچا سوا ہو گا ۔ اس کی عمر ان سب سے تھوڑی تھی ۔ یو جیرہ بھر جاگا ۔ اس کی پنڈلیاں گیتوں والی کھچی الیسی ہیں ۔ بوا ،

ننگڑیوں سے گھوڑی نو کس طرداں کا بو مار لکھے گا ؟"

"مَیں تو تجھے تلک نو کا بو (قابو) ماں رکھ سکوں ہُوں ۔ ہور (اور) تیں اوس دن چکر بلاں ہاں بس میری پنڈلیاں ہی دیکھتی رہی ہوگی، ہور کچھ نہ دیکھا ہوگا ؟"

"ہرٹ سے گمانی ہرنامے ! تیں کونسا ایسا کلتے ٹھلتے کا گبھرو ہے ۔ نہیں اوچا ہے نا نیچا! موٹا ہے نہ پتلا، کالا ہے نہ گورا، کچھ بھی تیہ نی ہے ۔ تجھے اپنی پنڈلیاں سوہنی لگتی ہوں گی تو تیں ہی انہیں چڑھتا چاتا رہا گر ۔ ارے ہرنامے تیں بتا سکے ہے میں نے تجھے پہلوں پہل کد دیکھا تھا ۔؟"

"مجھے کیا کھبر"

"جد تیں رو سا رو سا گوچھر والی تلیا کے دھوے بیٹھا تھا اپنے تایا سے تھاپڑ کھا کے ۔"

ہاں ہاں جد تمہاری کپلا گاے نے مہار سے ایکھ کے پودے کھائے تھے جس کی بڑائی کل ہوئی تھی ہیں تو سوچا تھا چلو نرا دی کی گائے نو ہی اپنا دل خوش کر لن دو ۔ پودے پھیر ہول آویں گے، اوپر سے تایا آگیا تھا ۔"

"اس نے کپلا نو ہی کتنا مارا تھا دو لاٹھیاں منہ پہ لگی تھیں سو تو آنکھ پھوٹتے ماچا سا پھا سا رہ گیا تھا ۔"

"تو تیں گوچھر والی تلیا پہ رو سا رو سا بیٹھا تھا، دھوے کھڑے ڈیک کی ایک چھیا پانی پہ گری تو نہ تو کھڑ کا بھد پانی پہ چھبل پڑے ۔ تیرا منہ تلیا ماں ایسا لگے تھا جیسے میں تجھے سبھے ماں دیکھ رہی ہوں ۔ میں تو تجھے دیکھ کیل نہ تی ۔ تیں اس طرداں بیٹھ جاتا جس طرداں گھرائن دلے رہ دالے کی مورتی ۔ اچھا رے یہ بتاں

چھوڑ، تیں یہ بتا گھوڑی تو میں نے بدکائی تھی تیں جھبڑی کا ناؤں یوں ہی لے
...... دیا تھا۔ اُسے کیوں ناحق ماں مروائی۔؟"

"میں چار یوں تھا اپنا ناؤں تیں بتاتی پھرتی۔"

ہور جھبڑی کی طرح ں لٹھوں سے ماری جاتی۔ پرے سے ہر نامے تیں
اکیس کر بانہ کہ، میرا اندا یو ناتھا اک گھوڑی کی آنکھ پھوڑ دیں ہور تیں تلے نا
گرے۔ مجھے ماپھ کر دے رے ہر نامے۔ میں تیرے پاؤں پڑ دں" ہرا اس
کا جی بھر آیا اور وہ رو رہی تھی۔

"یہ کیوں؟"

"جو تیں مر جاتا"

"میں مر جاتا تو کیا تھا۔ کرنی کی طرح ں کھال ماں بھوسہ بھر کے اپنے
دوا جے رکھ لیا ہوتا۔ ہور بھی آتے جاتے دیکھتے اتیں بھی......
.... دیکھتی"

جب بہت سے خوبصورت بلوریں موتی یکے بعد دیگرے
رخساروں پر سے پھسل پھسل کر جلد جلد زمین پر گرنے لگے تو ہر نام اپنی
دھوتی سے اس کی آنکھیں اور گال پونچھنے لگا۔ پلو اٹھنے سے اس کی داہنی
پنڈلی اور ران تر لوکی کو نظر آ رہے تھے۔ اشک ریزی کچھ دیر جاری رہتی لیکن
پنڈلی اور ران کی نمکینی نے ایسا لہرا گیا کہ وہ مجبور ہو گئی کہ اسے صاف نگاہوں
سے منظر غائر دیکھے۔ پھر ہر نام نے پیار اور رحم کے جذبہ میں آ کر اس
لہک لہک کر باتیں کرنے والی کی کھچی مصرفی چاہی وہ اس کے گونوا سے

لال لال ہونٹوں اور جھکا جھک رخساروں پر بٹ کرنا چاہتا تھا۔ اسے پاپ اچاسن کی سوجھ رہی تھی۔ ترلوکی پھدکتی چڑیا کی طرح اچک کر ذرا دور کھڑی ہو گئی۔ ہرنام بولا "ستیاناس گئی باتیں تو میرے سے اس طرح پلا جھاڑ کے الگ کھڑی ہو گئی جیسے تیرے اوپر کملا چڑھ رہا ہو۔ ذنگئی پنا چھوڑ۔ ڈھب ہو جا۔" ترلوکی کے منہ میں اس وقت یہ الفاظ تھے "او نانانانا رے نا نا رے نا جوانی کھائے! ابھی میری گمبھی نہ بھر آ پہلوں تھے لیوا کر لیں۔ میں تو تیری سہرے ڈودے کی بیاہتا بننا چاہتی ہوں، مجھے شگتی بنجارن کی طرح نار اکھنے میں تو تیرا دیا ہوا سیس پھول پہروں گی۔ جو تیں اک نوالہ کھانے گا بندی بھی اک ہی کھا دے گی جا دوہ نہیں۔"

ان دونوں نے ہاتھ ملائے تو ترلوکی بولی "جو کوئی ترلوکنی کو سیتا گ کی من تار کے ذیتا لودہ اس کی نہ ہوتی پر تیری ہو چکی، تیں ترلوکی کی ناتھ ہے۔ سورج مکھی کا پھول جس طرح سورج ہو گا اسی طرح جھکے گا۔ تیں سورج ہے، ایں سورج مکھی، ایں تیری آدھین ہو گئی۔"

اس وقت اس کے چہرے پہ اتنا چکیلا پن، شعبدہ بازی، ننگی، تحیر اور نشہ خیزی تھی کہ اسے شیطانی جادو کہہ سکتے تھے۔ یہ وجدہ حال نہیں تھا۔ مردنوں کے کنول خوب ہی کھل رہے تھے۔ اس وقت ہرنام جو کچھ بھی کر گزرتا مداخلت بلا مرضی نہ ہوتی۔ جب کوئی خود ہی دانی بن جائے تو لوٹ کھسوٹ کی کیا حاجت لیکن وہ اوپر کے جی سے تھوڑی تھوڑی ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "ارے کھڑے گھاٹ کا دھلا اچھا نہیں ہوتا۔ صبر کر صبر سیکھی بانکے بہ

تیجے کا جادو بڑھا چڑھا تو وہ جو تھوڑا بہت دوستانہ ہوا ہے اُسے بھی کھٹاک سے توڑ کے رکھ دوں گی۔"

یوں غیر آبادگی سی دکھانے سے کیا ہوتا ہے، کیونکہ اس کے ہونٹوں میں پھپھاہٹیں بھری ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں تماش بینیاں اور بُشرے پر مطلق العنانیاں پھر کیفیت انعکاسی نے اُسے گنگ سُم کر دیا۔ جبھی ایک طرف سے دھڑ دھڑ دوڑتا ہوا ہرنام کا تایا آگیا۔ دوسری طرف سے ترلوکی کا باپ اور جس طرح سے کسی کو شہد مکھی چمٹ جائے اور اسے کوئی جدا کرے۔ باپ نے بیٹی کو، تایا نے بھتیجے کو جدا کر لیا۔ تایا ہرنام کو اس طرح سے لیے جا رہا تھا جیسے وہ قیدی ہو۔

۴

اب ترلوکی پہ پہرے بیٹھ گئے۔ وہ باہر نہ نکلتی تھی۔ ہرنام کا تایا کھلے خزانے کہتا پھرتا تھا کہ وہ اسے کہیں دکھائی دی تو چیر میخا کر کے اس کا سر دھڑوں سے جدا کر دے گا۔ جب اسے کوئی کہتا "ان دونوں کا بیاہ کر دو۔" تو وہ شخصیت بگھارتے ہوئے ہرزہ سرائی کرتا۔ بیاہ اسنائی پاچھے بیاہ! وہ تو اس کا پہلو ہی کیا ٹلا کر چکا ہے۔ بیاہ کر کے کیا لے گا۔ لاوے کے جھوبجے "باڑی" ایکھ کُٹنی کی زاتی کرنے والے جیدور کی بیٹی کے ساتھ ہمارے بھتیجے کا بیاہ۔ جو لیوا ایسا ہوتا الگ آگے ہات نہ پاچھے پگا تو اس کی شادی جیدوروں ماں

ہو جاتی ۔ جو ترلوکنی کا باپ مہارے گاؤں سے کسی سہر ماجا کے بیلوں تو
جوتے کھاتا پھرے پھر بڑی مسکلوں سے اسے پٹہ داری مل جا ہو ر اتبار پڑت
پر کسی بنیئے بکال کا گھر پھاڑ کے مایا لاوے ۔ اپنا محل گروا کے تی عملہ
(تین منزلہ) بنوا دیوے تو پھر بھی اس کی کسمت چھوڑی بیٹی تو مہارے یہ نیچے جیسا
بر نا ہیں ملیگا ۔ کھریسل کُتیا کو "تو تمہاری جھول نصیب نہ ہو گی" چھچھوندر کے سر
نو چنبیلی کا تیل نہیں جڑے گا ۔ کیا یو تھوڑی بات ہے جو مہارے بھتیجے نے
ایک مجدور کی بیٹی کے راحت کا ٹیکہ لمھت ماں لگا دیا ۔ چونی کی ردی کی ایک ٹکی
مرگ کے سروے ما ڈلو کے کھالی ، گیہوں کے کھیت ماسیوں مجھے تو اسے
پھاڑ پھینکنا چاہیے " کچھ بے حد مکروہ الفاظ جو گھاسی رام استعمال کرتا پھرتا تھا
یہ تھے ۔ " میں تو یو دیکھا تھا جس طرح کوئی کا گج پہ گوٹھ کرے اگوٹھے پر
رسنائی کم لگی ہوئی ہو ، وا انشان پڑنے کی خاطر گوٹھے نوں اس طرح دبا دے
جیسے وا سانپ کا پھن دبا رہا ہو ۔ بس یوں ہی ہو رہی تھی " مگر یہ سفید جھوٹ
تھا کیونکہ وہاں ایسی ویسی کوئی بات نہ ہوئی تھی ۔ وہ تو دونوں فرشتوں کیطرح
پاک صاف اور بے گناہ تھے ۔

خاک اڑانے کے لئے یہ تکلیف دہ چرچے وُزیچن اور بک جھک "لاوے"
جبو گئے ، باڑی ایکھ ، گمی کی نرائی کرنے والے مجدور کی بیٹی کے ساتھ
مہارے بھتیجے کا بیاہ " ترلوکی کے کانوں میں پڑے تو اُسے اپنی تہی
دامنی پہ سخت قلق ہوا ۔ جو اس کا دادا شراب اور عورت کی علت میں زمین نہ
بیچتا اور اس کے بھی آٹھ ہلوں کی کھیتی ہوتی تو سر نام کا تایا اپنی مہمول نسبی

پر نہ ٹرتا تا نہ اسے وجہ نازش ہوتی اور نہ وہ دوسروں کی غریبی پر اتنے چھپے مارتا۔

کئی مہینے گھر بند رہنے کے بعد ترلوکی کا بیاہ پہاڑ میں گئے ہوئے کسی دوکاندار سے ہوگیا۔ جو ڈھک دئی سے گڑ خرید کرنے جایا کرتا تھا۔ جب وہ دلہن بنی تو اس نے نائن کی چھوکری کو اجرت کا روپیہ دیکر ہرنام کے پاس بھیجا۔ "ارے گجب مارے تیرے سیں ٹمکٹے بولے ! ترلوکنی سے جی اٹھا لے ہم تو پہر جارہے ہیں جہاں سے اس مہاری نہر کا پانی آوے ہے۔ چوملے کے دنوں مار پڑے پاجا بیٹھے۔ جدیہ ساتی ندی چڑھیگی تو تیں دیکھے گا میری لھاس پہاڑ سے بہتی ہوئی آرہی ہے۔ تیں بلیڈ ہاں آکے اسے پکڑنے کی کوشش نہ کریو۔ پکڑکے کیا لے گا۔ بہہ جانے دیئے جہاں پہ جا کے رکے۔ مجھے دیکھ کے چھاتی بھر آوے تو سبھ سبھ رو لیئے اجور جو رو دیا تو تیرا تایا پلیٹنا ہے وہ کہے گا بے کیوں ببر بانیوں کی طرح رووے ہے تیرا کوئی مر تو نہیں گیا، ہیں تیری کیا لگتی، اس نے مہاری جھبری نو ٹھوکر ماروی تھی۔ تیرے ہتھاڑ جادے گا۔" پیغام سنتے ہی ہرنام کی چیخ نکل گئی اور اس نے مقام سے اپنا سر دے مارا۔ نائی کی چھوکری ڈر کے ماری بھاگی کہ یہ کیا ہوگیا۔ تایا جو اسارے میں بیٹھا ڈیلے کے اچار اور دہی سے دوپہر کی روٹی کھا رہا تھا لڑکی کو دیکھ کر بھبکا۔ "پکل لیو، پکل لیو، پکڑ لیو، یو دا کی کھبر لائی ہو گی۔" لڑکی یہ کڑا کے دار آوازہ سنتے ہی صحن میں گر پڑی اور تایا نے پڑی ہی کی کمر میں مکے مارتے ہوئے بانہیں پکڑ کر اٹھا لیا اور

بھر گھسیٹتے ہوئے ڈیوڑھی تک لے جا کر گردنی دیتے ہوئے گلیارے میں نکال دیا۔

لوٹ کر اس نے اپنے بھتیجے کو ڈانٹا "ڈولا تو اٹھ جان دے، ابھی سے بھٹکنے لگا"۔ اس پر وہ اور بھی چلانے لگا کہ "ہائے میں کیا کروں، ہائے میں کیا کروں" اسے اصل میں اس وقت ترلوکنی کے یہ فقرے یاد آ رہے تھے۔ "نارے نا ابھی میری گھمبی نہ بھر آ پہلوں ہتھ لیا کریں جو کوئی ترلوکنی لو سیس ناگس کی من بی تارے کے (اتار کے) دیتا وہ اس کی نہ ہوتی پر تیری ہو چکی .... نارے نا .... نارے نا" یہ الفاظ اس کے کانوں میں خاص طور پر گھنٹی کی طرح بج رہے تھے اور اس کا طرفہ تماشہ چہرہ یاد آ رہا تھا۔

دولہا کے ساتھ باجے گاجے تھے۔ بارہ ماسی بیلدا لعل کی چوکی سے فنا دور موڑوں کے پاس نہر کی کلر پٹڑی پر باجے بجنے شروع ہو گئے۔ ہرنام کے تایا نے انہیں سنتے ہی کہا "لو بھئی جاگ گئے ریو مہر والا آ گیا پر اسے کہہ دیو ڈھک وئی کی سپھید ملی بڑی چیر پر ہے کھوب نمک لگا کر کھائے۔"

ترلوکی یہ باجے سنتے ہی کپڑے پھاڑنا چاہ رہی تھی۔ اور ہرنام ان کی پوں پوں دھوں دھوں پر شمال کی طرف روڑا دہ گوچھر اور ڈیک والی تلیا کے پاس سے گزرتا ہوا، کریر اور بیندوں کے جنگل میں نکل گیا۔ اس کے سامنے گیدڑ، لگڑ بگڑے اور کلانچیں بھرتے ہوئے چیتل سانبھر آئے

لیکن وہ انہیں میں سے بھاگتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ جب وہ پرلے سرے پر پہنچا تو وہاں ٹرک چھپر بھر بھر رہے تھے۔ یہاں سے باجوں کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس کے سامنے "نگر" اور بلاغش تمش پانی کی چھوٹی سی دھار بہ رہی تھی۔ وہ فوراً پانی پینے لگا۔ اس نے رات یہیں کاٹی۔ اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ درندے پانی پینے آئیں گے۔ تمام رات اُلّو اپنی ہزار داستانی سے چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو ڈھا ڈرا کر پکڑتے کھاتے رہے۔ پیلو، کریر، اور تیندو کے جنگل میں لگڑوں اور گیدڑوں نے قیامت برپا کیے رکھی۔ آسمان پر اور چھوٹی دھار کے پانی میں ستارے جھلمل جھلمل کرتے رہے، رت چڑیوں کی گل بانگ اس کے کانوں میں آتی رہی۔

ترلوکنی اپنی سسرال میں روتی ہوئی گئی، مگر اس کے ہرنامی کو پتا تھا کہ وہ اس کے لئے نہیں ٹھنک رہی تھی کہ باپ کا گھر چھوٹ رہا ہے بلکہ اس لئے کہ ہرنامی کا گاؤں اور ہرنامی چھوٹ رہا ہے، اس کا دکھ ہرنا چھوٹ رہا ہے۔ بیاکرنے والیاں تو اسے کوکھ مانگ سے ٹھنڈی رہنے کی دعائیں دے رہی تھیں، لیکن وہ منہ منہ میں بین کر رہی تھی: "بھگوان اس کرموں کھوئی کو ں پہاڑ بیچ کے کیوں مارے ہے۔ مجھے جیانا چاہے تو بھر عمر کو ہرنامی کی چیپی کرنے کے واسطے یہیں چھوڑ دے۔ میں اس پہ مرمٹی۔ میرا جیا اس بنا لوٹے۔ گھن کی چوٹ کھا لوں گی پر اس بنا نا ہیں رہا جاویگا جو چکر ملان ماپا بیٹے کے دن میرے من ما چور کھڑکی سے آ کے رہن بھی لگا تھا۔ یو بیاہ میں ٹھیک کرایا ہے، یو تو میرے ماں باپ نے کیا۔ یو بیاہ

نا ہے۔ جو ہے، ہے یہاں کوئی جیواسا بھی نہیں ... مرگھٹ ہے یہیں اپنے سرنامے کی یاد میں پھڑک پھڑک کے مر جاؤں گی۔ پاپیتے کے دن گرد اڑتا ہوا اچھالا گے۔ بیاہ ساوی ما سدا سہاگن۔ پرے رے پرسنتا کے پنچھی تیں مجھے کیا بول بول کے کھجا دے ہے۔ سجا تارہ کا ہے ین جیڑھ جا نہیں تو یہاں تیرا نیچ مارا جاگا۔ سدا سدا سہاگن!"

ترلوکی کے جانے کے بعد سرنام زیادہ دن گاؤں میں نہ ٹھہر سکا۔ اس کا چہرا ہجراں زدگی سے ایسا اترا اترا سا رہنے لگا جیسے اسے زہر باد ہو گیا ہو۔ وہ گویا اس مرغ کی طرح ڈینے گرائے گردن جھکائے پھر رہا تھا جو رانی کھیت کی وبا میں مبتلا ہو گیا ہو۔ گو ترلوکی اس سے ملتی نہ تھی لیکن یہ خیال کہ وہ ڈھک وئی میں موجود تو ہے اس کے دل کو کچھ نہ کچھ ٹکائے رکھتا تھا اور اب جو وہ پہاڑ محل میں چلی گئی تھی تو وہ لوٹا لٹا رتا رتا گرڈ ٹوٹا سا پھر رہا تھا۔ ڈھک وئی اور اس کے سوانہ سرنام کو دونوں زہر دکھائی دے رہے تھے۔ جوں جوں دن ترلوکی کی رخصت کے بعد گزرتا سرنام اسے رمضان کے روزے کی طرح گنتا اور اس کے دل میں اتنے ہی چوبے چبھتے جا رہے تھے جیسے کسی ٹل تیوں سے تولا نکال لیں اور وہ نہیں بجتی۔ سرنام ایسا ہی ہو رہا تھا۔ چپ چپ، اکھڑیا اکھڑیا، دکھیا دکھیا سا وہ گھر گاؤں چھوڑ کر گوبند باغ میں پڑا رہا۔ صبح صبح پیڑیوں والے کھیت کے سامنے نہر میں نہاتا اور پھر دو منزلہ کوٹھے پہ پڑی ہوئی سرکی میں اکیلا بیٹھا ہوا حقہ پیتا رہتا۔ دو تین دن تو گھاسی رام نے اسے کچھ نہ کہا لیکن بعد کو گھر سے روٹی بھیجنی بند کر دی۔

اس کے سامنے تایا کی مثال موجود تھی، جو بیوی کے صدمے میں گاؤں چھوڑ کر لام پر چلا گیا اور وہاں سے غم غلط کر کے وہ اچھی حالت میں لوٹا تھا مگر خوب کسٹر بن کر۔ اس لئے ایک شب جب برساتی ندی کا ریت چاندنی میں ایسا چمک رہا تھا جیسے ترلو کی ململ کا اونچا سفید قمیص اور بہت سے چُنٹ والا سُتھے کا سفید گھگرا تیز دھوپ میں پہنے کھڑی ہو۔ قصبہ مہوربہ کی جانب اجڑ علاقے سے غول بیابانی کی واویلا ایسی آوازیں آ رہی تھیں اور وہ کہ جس کی بھوسلی بھوسلی پنڈلیاں گیتوں والی اچھّی ایسی گول تھیں فوج میں بھرتی ہونے کے لئے جا رہا تھا۔ اس کے ارادے کبھی بھی ڈھلک وئی لوٹنے کے نہ تھے۔ جاتے جاتے وہ ریڑسے پر گیا جہاں ترلو کی نے اس سے اپنی پچھی بھروائی تھی اور اس نے ترلو کی کے گودھا ایسے رنگت دار ہونٹوں کی طرف منہ بڑھایا تھا۔ یہ اس کے عہدِ شوق کی یادگار تھی۔ پھر اسے ترلو کی کی بڑی پیوندی جامن ایسی پتلیاں یاد آنے لگیں اور وہ پہاڑوں کی ایک ٹک بیٹھا ہوا دیکھنے لگا جہاں وہ اپنے شوہر کا گھر آباد کرنے کے لئے گئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ترلو کی اس کی یاد میں چوڑیاں ٹھنڈی کرتے ہوئے دھاہ مار مار کر روتی ہوئی اپنا سر گھٹنوں سے پھوڑتی ہوئی پھر رہی ہے۔ پھر یک لخت وہ گویا ترلو کی کی آواز سننے لگا:

ریڑسے پہ تو نگی بجاوے میں تو چھاونی جاؤں گی
چھاونی جاؤں گی چھاونی جاؤں گی

وہ تو چھاؤنی بلاوے میں تو چھاؤنی جاؤنگی
چھاؤنی جاؤں گی، چھاؤنی جاؤں گی

وہ ناک کی سیدھ میں پیلو، کریر اور تیندو کے جنگل میں سے ہٹتا ہوا انہی پہاڑوں کی طرف چلنے لگا اور کوئی آدھ میل تک چلتا رہا۔ پھر پچھم دشا سے کنیا دانی کا بادل آگیا۔ آسمان پر زبردست ہڑبڑی مچ گئی۔ وہ اب بھی چلا جا رہا تھا۔ اس کے کپڑے مینہ سے بھیگ چکے تھے۔ چلتے چلتے اس نے قصبہ مہوریہ سے کوہ سرگ پربت جاتی پکی سڑک پکڑ لی۔ یہاں پہاڑ سے ادرک بھر کے لاتا ہوا کوئی ٹرک آ رہا تھا اس نے اشارے سے ٹرک ٹھہرایا اور یوں چھاؤنی کی راہ لی۔ پانی اب بھی پڑھ رہا تھا، بادل گھوم رہے تھے، اسے ایک پاک خیال آ رہا تھا جو آنا نہیں چاہیے تھا کیونکہ اس کے تعلقات زلوکی سے بے ڈھنگی قسم کے تھے "برکھا شروع ہو گئی ہے ساون میں سلونو آئے گی۔ میری بہنیں سلونو کے تہوار پر میرے پہونچے سے راکھی باندھا کرتی ہیں اب کے تو میں زلوکی سے راکھی بندھوانا پر اب تو وہ میری بہن نہیں کچھ اور ہے۔"

دھومن

جب مانڈو کے باپ نے سنا کہ لوئی پاس سے دس میل جو موضع گُنجر والی میں ان کی برادری کی ایک لڑکی مرچی ہے، وہ جُمّن جاٹ کے ساتھ سورج والے تالاب پر پکڑی گئی، تو یہ اگلے ہی دن گُنجر والی پہنچا کہ مرچی کو اپنے لڑکے مانڈو کے لئے مانگے۔ اسے خیال تھا کہ جو لڑکی اتنی بدنام ہو گئی ہو اس کا کوئی گاہک نہ اٹھے گا اور مرچی کے بڑے بھائی گُلتے کو بھی کوئی لڑکی پسند نہ کرتی تھی۔ اس کے چہرہ پر بال نہ اُگے تھے اور ٹھوڑی پر جو تھوڑے سے بالوں کا گُچھا تھا اس نے گُلے کی صورت اور بھی بگاڑ رکھی تھی۔ یہ پھر بھی ان تھوڑے سے بالوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ان پر تیل لگاتا اور انہیں انگلیوں میں سہلاتا رہتا لوگ پھر بھی ٹھٹھول میں اسے ہیجڑا کہتے۔

مانڈو اور اس کی بہن دھومن دونوں ہی روپ رنگ والے تھے لیکن ان میں دو بڑی خرابیاں تھیں ایک تو یہ غریب تھے دوسرے ان کی بابت مشہور تھا کہ یہ موسو بھنگی کی اولاد سے ہیں ان کی ماں موسو بھنگی کے ساتھ بھاگ بھی گئی تھی۔ مانڈو اور دھومن کا باپ نمازی اور

پرہیزگار آدمی تھا اگر اس کی بیوی نکھد نکل آئی تھی تو اس میں اسے الزام نہیں دے سکتے تھے۔ اس نے اپنی لڑکی کو قرآن پڑھایا تھا۔ اور وہ باعصمت بھی تھی لیکن ماڑو اپنی ماں پر گیا تھا اس کی بدشہرتی یہاں تک تھی کہ لوگوں نے اسے گائیوں تک سے ناہنجاریت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

ماڑو کو کوئی بھی اپنی لڑکی دینے کو تیار نہ تھا البتہ دھومن کے کچھ گاہک موجود تھے۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی کانسی کے کٹورے کو پیتل کی چمچی سے بجا رہا ہو۔ وہ منہ بولتی مورت ایسی تھی۔ ہلکے رنگ کی کلیوں ایسی۔ ماڑو کے باپ کی مرضی تھی کہ دھومن کو اس طرح سے بیاہا جائے کہ اس کے عوض ماڑو کو بھی بیوی نصیب ہو سکے۔ کوئی اور جتن اس نوجوان کی شادی کا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ دھومن بھی اپنے بھائی کے لئے بھینٹ چڑھنے کو تیار تھی۔

ماڑو کے باپ کا مشن کامیاب رہا۔ مرچی کی شادی ماڑو سے اور دھومن کی گھگے سے طے پا گئی۔ یہ آٹے ساٹے کا رشتہ تھا۔

ابھی اس آٹے ساٹے کی سگائی کو چند دن ہوئے تھے۔ کہ گُجر والی سے خبر آئی کہ مرچی کو نوبت کا بخار آ رہا ہے۔ اسے فکر ہوئی کہ کہیں ہونے والی دلہن چل نہ بسے، اس نے اپنے باپ سے کہا۔

"بابا رے بابا، جو وہ مر گئی تو مجھے سب رنڈوا کہن لگینگے، دوسرا بیاہ ہوا تو میں دوہاجو بن جاؤنگا۔ میں تو گُجر والی جاتا ہوں اسے پوچھ

کے آؤں گا۔

باپ :۔ بیاہ سے پہلے ساس سوسروں کے گھر نی جایا کرتے۔

ماڑو :۔ نہیں بابا نہیں ! چلے جایا کریں ہیں !

ماڑو نے لاٹھی چادر اٹھائے اور ظہر کی جماعت کے بعد گنجر والی روانہ ہوگیا۔ دھوپ اس وقت بھی بہت تیز تھی۔ حالانکہ سورج آکاش پر ھمانڈ سے اتر چکا تھا، گیہوں کے کھیتوں میں جو گھموئی کھڑی ہوئی تھی تو اس کے کھٹے کھٹے زرد پھولوں کی رنگت آنکھوں میں چبھی جا رہی تھی۔ گھموئی کے کانٹے ماڑو کی پنڈلیوں اور ٹخنوں میں چبھ گئے تھے۔ لوکا یہ حال تھا کہ کھرسائی نکئی، باجرا تک سوکھا جا رہا تھا۔ راستہ میں جو خشک خونی ندی آئی تو اس میں ایک سگڑ کا کھڑا تھا۔ اس کی سواریاں نیچے اتری کھڑی تھیں کیونکہ سگڑ کا ایک بیل گرمی کے مارے زبان نکالے گرم ریت میں بیٹھا ہوا ہونک رہا تھا۔ کنارے کھڑے ہوئے پھر السں تیز ہوا میں سائیں سائیں کر رہے تھے۔ کوئی کوئی بگولہ بھی گھومتا گھامتا پھر رہا تھا۔

جب ماڑو سسرال پہنچا تو مرچی اسے دیکھتے ہی زور زور سے گالیاں بکنے ...لگی۔ کسی نے اسے بتا دیا تھا کہ ہونے والا شوہر ہے "اسے یہاں سے کاڑھو، اسے یہاں سے کاڑھو۔ یہ جمن جاٹ کا سسرا ہے، ہتھوڑی لاؤ، میخ لاؤ میں اس کے سر یاں میخ ٹھوکونگی، جس نے اسے نوتنا ہوگا۔" (دعوت دینا) ۔ مرچی نے اٹھ کر آلے سے ہتھوڑی اٹھالی، ماڑو سردری کے کونے سے لگا ہوا اسے مڑ مڑ دیکھ رہا تھا۔ جب مرچی اس کی طرف

پڑھنے لگی تو دوسروں نے اسے علیحدہ بیٹھنے کے لئے ڈیوڑھی میں بھیج دیا کہ لڑکی کو تبخیر ہو رہی ہے۔ یہ ہوش میں نہیں۔

ماڑو ڈیوڑھی میں جا کر گھموئی کے کانٹوں لگی پنڈلیاں اور ٹخنے سہلانے لگا ان میں جھاڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ دوکان سے میٹھا تیل لے آیا۔ اسے مالش کرتے ذرا سی دیر ہوئی تھی کہ جمن جاٹ اُسے آ کر پوچھنے لگا۔ "کیسی ہے وہ؟"

ماڑو:۔ کیسی ہوتی، اچھی ہے۔

جمن جاٹ:۔ میں تو یوں پوچھوں ہوں، اس کی بیماری کیسی ہے؟"

ماڑو:۔ اسے تو خفقان ہو رہا ہے۔ اول پھول بک رہی ہے۔

پھر اندر سے کوئی گھڑے اور بہنگی لے آیا کہ پاہونا پانی لے آئے۔ جمن جاٹ اسے دیکھ کر باہر گیا، کنوئیں پر یہ دونوں پھر ملے کیونکہ جمن بھی وہاں آیا ہوا تھا۔ یہاں ماڑو کو خبر لگی کہ اس کی ہونے والی بیوی کا کمانترایہ ہے۔ اسے جمن پر غصہ بھی آ رہا تھا اور اس کی سمجھ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ جو جمن اس سے یارانہ نہ گانٹھتا تو اس سے اس کی شادی کیسے ہو سکتی۔

ماڑو سسرال کے گھر روزنہ پانی بھرنے لگا، مرچی اچھی ہو گئی تو وہ بے بھا وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ جیسے اس کی آمد مضحکہ خیز تھی۔ ایسا ہی اس کا دیرپا قیام تھا۔ مرچی اس سے بہت اکتا گئی تھی، کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے اس کا جمن کے پاس جانا بھاری ہو گیا، ایک دن ماڑو گھڑونچی کے چار گھڑوں میں سے دو گھڑے بہنگی میں رکھ کر چلا تو مرچی بولی۔

"پاہونے جی، تاولے آنا۔ بڑی تس لگ رہی ہے۔

جب وہ بہنگی لے کر چلا تو مرچی اس کی اترائی ہوئی چال دیکھ رہی تھی۔ وہ پہلوانوں کی طرح سے کندھے ہلاتا جھومتا لمبے ڈگ بھرتا جا رہا تھا۔ اس وقت ایسی گرمی پڑ رہی تھی کہ اسارے کے ٹین تک میں بھرا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ جب ماڑو نے واپس آکر دو بھرے ہوئے گھڑے گھڑونچی پر رکھے تو اس نے دوسرے دو گھڑوں کو خالی پایا۔ اس نے پھر بہنگی سنبھالی اور یہ بھی بھر لایا۔ واپسی پہ پھر پہلے گھڑے خالی نظر آئے۔ ماڑو اس طرح پھیرے پہ پھیرا کر رہا تھا اور مرچی اسے بے وقوف بنا رہی تھی۔

جب دوپہر ڈھلا، تو مرچی کی سوئی ہوئی ماں ہڑبڑا کر اٹھی اور پوچھا پاہونے کو کھانا کھلا دیا؟

مرچی:۔ پاہونا تو یہاں کوئی نہیں۔ ایک چھوڑا اللہ ڈتو آیا ہوا ہے۔ وہ پانی بھرنے چلا گیا۔

ماں:۔ وہ تو میرے سونے سے پہلے گیا تھا۔

مرچی:۔ آدمی بہنگیوں پہ بہنگیاں لا رہا ہے میں گھڑے رتا دول ہوں۔ وا پھر چلا جاوے ہے۔

ماں:۔ کسی کو یوں تنگ نہیں کرا کرتے۔

مرچی:۔ سسرال کی دہلیز دو ہلیز ابھی نہیں کھنڈلا کرتے۔ یہ تو یہاں چھاونی ہی ڈال پڑا۔

اسی وقت ماڑو بہنگی لے کر آگیا۔ اس سے بہنگی تک نیچے نہ

رکھی گئی ۔ کیونکہ وہ تنولا[1] گیا تھا ۔ اس کی آنکھیں گویا بے ہوشی میں بند سی ہو گئی تھیں ۔ وہ گر پڑا تھا ۔ اور دونوں گھڑے پھوٹ گئے تھے ۔ مرچی کو اب بھی اس پر رحم نہ آیا بلکہ کلکلا[2] کر بولی :۔

" واہ رے بل دھاری[3] ! اتنے کا پانی نہیں لایا جتنا نقصان کر دیا ۔"

پھر مرچی کی ماں ترس کھا کر اس کے پاس آگئی ۔ اور ہونے والے جنوائی کا سر سینہ سے لگا لیا ۔ مرچی نے اسے فوراً شکر کا شربت پلایا ۔ ماڑو نے آنکھیں کھول دیں تو اس کی ہونے والی بیوی نے اپنی بت انگلی[4] ہونے والے شوہر کی طرف کرتے ہوئے پھر کہا " ارے اوت پٹانگی ! اتنے کا پانی نہیں لایا جتنے کا نقصان کر دیا ۔ "

ماڑو :۔ میں نوے دنئے گھڑے خرید کے لاؤنگا ۔

مرچی :۔ اچھا پا ہونے جی ، مونڈھوں کا کیا حال ہے ؟

ماڑو :۔ سوجے جا رہے ہیں ۔

مرچی :۔ لو گڑ لا دوں سینک کے لاؤں گی ۔

ماڑو :۔ سینک کرنہ لائیو ، گرمی پڑ رہی ہے ۔

مرچی لو گڑ بلا سکا ہوا تو نہ لائی لیکن اس نے اس پر نمک بُربرایا ہوا تھا ۔ بجائے کندھوں پہ رکھے تو ماڑو کے جھلاٹ ہی تو لگ گئی ، وہ ناچ

---

[1] تنولانا ۔ بے ہوشی وغیرہ میں آنکھوں کے سامنے کالا نظر آنا ۔

[2] کلکلانا ، غصہ میں بولنا [3] بل دھاری :۔ طاقت والا ۔

[4] بت انگلی :۔ اشارہ انگلی ۔

سا گیا۔ مرچی کی ماں تو گر ہٹا کر اس کے کندھے سہلانے لگی، مرچی نے اپنی
آنکھوں میں شیطان بھر لیا تھا۔ اور وہ ہونٹوں ہونٹوں میں ہی مسکرا رہی تھی
ماڑو کو اس بے حیا شرارت میں بھی حسن شرارت نظر آ رہا تھا۔ یہ لڑکی اسے
کھو سر پر گھسیٹ رہی تھی۔ اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اسے پھولوں کی سیج مل گئی۔
مرچی نے ہونے والے شوہر کو رَبّہ بابا ہی نہیں تھا بلکہ اُسے تو اس نے
اپنی ہتڑ کی سی لگا دی تھی۔

ماڑو مرچی کو خبر نہیں کیا سمجھنے لگا تھا۔ حالانکہ حسن صورت میں وہ
کچھ بھی نہیں تھی۔ اس کا ماتھا تنگ تھا۔ آنکھیں چھوٹی اور ایک دوسرے
سے دور دور، اس کی ٹھوڑی نوکدار تھی۔ اور رنگ گھورا سانولا۔ اس
کے مقابل ماڑو گو بھنگی کے نطفہ سے سہی لیکن اس میں نمک سا تھا
ویسے ان دونوں کی شادی بے جوڑ نہیں تھی۔

ادھر لگے اور دھومنی میں بہت فرق تھا۔ لڑکی کم عمر بے تمکنت
لیکن بیاہی، سادہ مزاج اور لاڈلی سی تھی، لگا ہیجڑا سا اور بد ڈول تھا۔
لیکن چالاک اور کسیلا، اگر دھومن شربت کا گھونٹ تھی تو یہ ٹھرا تھا۔
دھومن ابھی تک واقعی اچھی طرح سے رچ بس بھی نہیں ہو پائی تھی اور
اس لگا گونا اتنی کم سنی میں نامناسب اور خطرناک تھا۔ لیکن چونکہ شادی
آٹے سانٹے کی تھی۔ اور ماڑو جلد از جلد مرچی کو لانے کی فکر میں تھا اس
لئے دھومن کو نہیں روک سکتے تھے۔ پھر کچی یہ طے پا گیا تھا کہ جب
تک جوان نہ ہو گا اپنی بیوی سے الگ رہے گا اور وہ دو چار دن لیں

ہی ٹھہر کر میکے واپس آجائے گی۔
مرچی اور گلے کی نیتوں میں بڑا فتور رہتا - یہ سوچے بیٹھے تھے کہ ماڑو اپنی دلہن کو صرف دو تین رات رہ سکے گا - پھر یہ ہمیشہ کیلئے اپنے میکے چلی آئے گی - ان کا ارادہ یہ بہانہ کرنے کا تھا کہ جس مطلب کے لئے بیاہ ہوا کرتا ہے ماڑو نے تو وہ مطلب اپنی بیوی سے پورا کر لیا تو جب تلک دھومن سے مطلب پوری نہ ہو سکے گی اور اس میں برس کے قریب لگے گا - نہ مرچی لوٹی باس اپنی سسرال جائے گی اور نہ دھومن کو میکے بھیجا جائے گا - ہاں دھومن کو لے جانے کا جب اختیار ہو گا جب وہ مرچی کیطرح سے پڑتال لی گئی ہو گی - جب اس کے خوشی پورے نپٹاؤ کے بعد باپ کے گھر لوٹی ہے تو یہ بلا نپٹارے کیسے چھوٹ سکتی تھی -
ماڑو پتھر کے بدلے گلے کو ہیرا دے رہا تھا - لیکن اسے خبر نہیں تھی کہ شاید ہیرے کے ساتھ اسے پتھر سے بھی ہاتھ دھونے پڑینگے - آٹے ساٹے میں ایسے پر پیچ ہوتے ہی رہتے ہیں، یہ جہاں ماڑو پہنچ چکا تھا - اور پھر مرچی ایسی روکھی سا کھا خور لڑکی سے یہی امید رکھنی بھی چاہیئے تھی -

۲

ایک رات عشا کی نماز سے تھوڑی ہی دیر بعد گنجیر والی کے بہت سے لوگ گلے کی ڈیوڑھی کے آگے گیارہ بیس کھڑے تھے - گھر میں

نئی دلہن دھومن زور زور سے چلا رہی تھی۔ گلا اپنی شب زفاف میں تھا، لوگ کہہ رہے تھے۔ "مانا یہ میاں بیوی ہیں، پر وہ بچہ ہوئی اور یہ گولی بند جوان"۔ اندر دھومن بھی اپنے شوہر سے رو رو کر فریاد کر رہی تھی "ارے میں تو ابھی ادنی ہوں، ادنی کی تو کوئی قربانی تک نہیں کرتا"۔ پھر اس کے شوہر کی منطق بھی اپنی جگہ درست تھی، وہ جواب دے رہا ہے "تو تو ادنی ہے پر جو تیرے بدلہ ماں (یں) اگئی ہے وا (وہ) تو ادنی نہیں یہ فیصلہ اپنے بھائی سے کر کے آنا تھا۔

دھومن اپنا تن گُگے سے بالکل نہ بچا سکی۔ جب گُگے نے اسے چانب چڑھایا تو اسے شوہر سے رچنا پڑا۔ وہ تو خوف کے مارے اب سانچے میں ڈھلی جا رہی تھی، گلا اسے یہ بھی سمجھائے جا رہا تھا۔ ہمارا نکاح تیبچی کا نکاح نہیں، تو نے وہ رسے دیکھے ہوں گے جن پر سے جمنا کا جھولا چلے ہے۔ جھولے میں ایک کنارے کا آدمی دوسرے کنارے جا سکے ہے، جتنے تگڑے وہ رسے ہیں ان سے زیادہ تگڑا ہمارا بیاہ ہے۔"

جب دھومن کی کلکاریاں بند ہو گئیں گو وہ ٹھکر ٹھکر کر رہی تھی، لیکن ٹھکر ٹھکر کی آواز تو کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ تو لوگ یہ کہتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ "میاں بیوی کے معاملوں میں ہم دخل نہیں دے سکتے۔ جو دھومن بدلہ میں نہ آئی ہوتی تو اس پر رحم کھایا جا سکتا تھا۔ گُگے کی مرضی تھی کہ اس پر چاہے جتنے زور سے آرا چلائے وہ اس کا ہاتھ نہیں

روک سکتی تھی۔

ادھر مرچی نے اپنے ہفتہ بھر کے قیام میں مارڈو کو شیشہ میں اتار لیا تھا۔ یہ پہلے ہی سے کھیلی کھائی تھی۔ اسے دھومن ایسے سخت امتحان سے نہیں گذرنا پڑا تھا۔ یہ اپنے شوہر کی ایسی میٹھی پیاری بن گئی تھی کہ وہ اپنے بھاگ میں پھولا نہیں سماتا تھا۔ مرچی اس سے ٹھٹول بھی کرتی تھی "میا نانا تا دے کے سجان بہولے آیا۔"

مارڈو :- اور کیا۔ اور کیا۔

مرچی :۔ گگا پانی کو پال پوس کے جوان کرے گا۔ جب تلک وہ جوان نہ ہو تو بھی میرے دھورے نہ آ۔

گگے نے دھومن کو شہت (شہد) میں لگائے کے رکھی ہوگی اور تو میری ہر گھڑی چھوڑ بازی کرتا رہے ہے۔

ہفتہ بھر بعد مارڈو اپنی دلہن کو سسرال لے کر چلا۔ گرمی اب بھی خوب پڑ رہی تھی۔ دھوپ سے بچاؤ کی خاطر بیل گاڑی پر دوڑ اتانا ہوا تھا۔ گاڑی میں بورے سے بھری ہوئی مٹکی تھی جو مارڈو اپنی بہن کے لئے لے جا رہا تھا کہ وہ بورے کا شربت پیے گی۔ ستو بھی تھا اور پانچ مٹی کے گلاس بھی تھے۔ جن کی سوندھی سوندھی خوشبو مزا دیتی ہے۔ لونی باہر سے گنجر ذالی تک کا سفر انہوں نے خوش خوش طے کیا۔ راستہ ہی میں خونی ندی آئی جس کا پاٹ ایک فرلانگ کا تھا اور جو اپنے کنارے کے دیہات کو اجاڑتی رہتی تھی۔ اس کی بھینٹ ہر سال کوئی نہ کوئی

انسان چڑھتا رہتا تھا۔ اس لئے اسے خونی ندی کہتے تھے۔ اس وقت یہ ندی نہایت ہی کس مپرسی کی حالت میں خانہ بدوشوں کے چھوڑے ہوئے چولہے کی طرح پڑی ہوئی تھی جو کبھی بھی آباد ہونے والا نہیں ہوتا۔ اس کے کنارے سونے تھے۔ یہ اشتباہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ برسات میں اس کی گنگھاٹوں سے بڑے بڑے مہیر دل سو بھی نہیں سکتے ہوں گے یہ مرا ہوا اجگر اژدہا سا ان کی جھریوں میں دن رات پھنکارنے لگتا تھا۔

گنجر والی یہاں سے دو فرلانگ تھا وہاں کی مسجد کا آدھے انڈے ایسا سفید گنبد اور سونے کے پھول والا کلس درختوں کی ہریائی میں معجزہ سا معلوم ہو رہے تھے۔

بیل گاڑی ڈیوڑھی کے پاس آ کر رکی۔ مادھو اپنی پہلوانہ چال دکھاتے ہوئے مٹکی ڈیوڑھی میں رکھ آیا۔ مرچی گاڑی سے کود کر اتری۔ اس نے اپنے شوہر کو ڈیوڑھی ہی میں بیٹھنے کو کہا اور فوراً ہی بھنگی سے آئی کہ جنوائی پانی بھرنے چلا جاوے۔ اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ جب اس نے اپنی بیوی سے پانی مانگا تو اس نے منہ سکوڑ لیا۔ اور تڑک کر بولی ”کنویں پہ پی لئے“ اس وقت مادھو کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے خونی ندی میں ایک بارگی طوفان آ گیا ہو۔ اب تک تو اس کی بیوی اچھی خاصی تھی اور ابھی اس نے کیوں غصہ میں آ کر سیہہ کی طرح سے کانٹے کھڑے کر لئے تھے اور آنکھیں الو کی طرح سے دکھائی

شروع کر دی تھیں۔ ساس کا تو یہ حال ہو گیا تھا جیسے وہ بیاہ کا ٹنڈرک بھنڈا کر دینے کو تیار ہو، اس نے اپنا منہ کیسا سکوڑا ہوا تھا۔ اور دھوبن اپنے بھائی کو ملنے کے لئے رو رہی تھی۔ لیکن اسے گُلّے کے مار کے ڈر سے روکا ہوا تھا اور ایسا چپ کیا ہوا تھا کہ ڈیوڑھی میں آواز نہ جائے۔

مرچی کا رویہ اپنے خاوند کی طرف سے معاندانہ ہی نہیں بلکہ ٹُرّا تھا۔ وہ بات کرتے ہوئے سر توڑتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ کلّو مارو کو اس کا یہ کیسا بُرا تو لگ رہا تھا۔ لیکن اس کی نشا ٹھنڈا ان کر ہی بہن کو گھر لے جانے کی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اس نے اگر زیادہ چیں چپٹ کی تو اسے چیتھڑے کی طرح پرے پھینک دیا جائیگا۔ مرچی اسے دھوبن کے طفیل میسر آئی تھی۔ اور جو وہ اسے یہاں چھوڑ گیا تو پھر مرچی بھی ہاتھ سے جائے گی اس لئے وہ تھوڑی دیر تو منہ سا بنا بیٹھا رہا اور پھر بھوکا پیاسا بہنگی لے کر چلا گیا۔ اب اس کی چال پہلوانوں ایسی اور جھومنے والی نہ تھی۔ وہ پہلے ہی کی طرح سے پانی بھرنے لگا۔

گھر آئے جنوائی کو شکرانہ کھلاتے ہیں۔ مارو کو دو وقت چٹنی روٹی ملتی تھی اور روٹی بھی باسی تیاسی۔ مٹکی کے پورے کا شربت سبھی گھر والوں نے پیا مگر مٹکی لانے والے کے ہونٹ شربت سے ایک مرتبہ بھی تر نہ کئے گئے۔ دوپہر کو اس کا بسیرا ڈیوڑھی میں ہوتا تھا اور رات گلی میں بسر ہوتی تھی۔ یہ تاؤ اس لئے کیا جا رہا تھا کہ وہ جان جائے کہ ہوا کس رُخ چل رہی ہے۔

مارٹو کو دھومن سے ایک دفعہ بھی ملنے نہ دیا گیا۔ جب وہ اس کے لے جانے کے لئے تقاضا کرتا تو جواب دیتے اس کا تو یہاں جی لگ گیا ہے۔ وہ آپ نہیں جانا چاہتی۔

پہلے پہلے مارٹو کو یہ بھی کہا گیا کہ ابھی تک ساٹے میں آئی ہوئی کے ساتھ مانگ نے پھانکا پھانکی نہیں کی ہے جب تک گگلا اپنی بندوق نہیں چلا لیتا دھومن میکے نہیں جائے گی اور نہ مرچی کو سسرال بھیجا جائے گا۔ لیکن جب کئی لوگوں نے مارٹو سے شکایت کی کہ کل جگ ہے۔۔ کل جگ جوان ناتا لینے کی خاطر سگے بھائی نے اپنی ایانی بہن بیاہ کر بھیج دی ان کی پہلی رات کو سارا گاؤں جاگتا رہا اور سنتا رہا کہ جیتی چڑیا کے بچے کو ڈھرٹا کو اپنجوں میں دبائے کھا رہا ہے اور وہ چیں چیں کر رہی ہے۔ اس کے بعد اس میں کوئی کلام نہ رہا کہ دھومن کے ساتھ اس کے شوہر نے پھانکا پھانکی نہیں کی۔ اب یہ عذر تو باقی نہیں رہا تھا کہ جب تک گگلا اپنی بندوق نہیں چلائے گا نہ دھومن میکے جائے گی نہ مرچی سسرال لیکن مرچی کے سسرال والے اب مارٹو کو خالی ٹرخانے پر تُل گئے تھے۔

پھر مرچی کو چنتا ہوئی کہ مارٹو تو چیچڑ ہی بن گیا۔ وہ اسے ٹالنے کے جتن سوچنے لگی۔ ایک دوپہر مارٹو پانی کی بہنگی لے کر آیا تو ڈیوڑھی کے کواڑ بند تھے اور اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس نے کواڑ پیٹنے شروع کر دیئے۔ جمن جاٹ اسے دیکھ کر ہنستا ہوا گذرنے لگا۔ پھر اس کے کواڑوں

کے پاس پہنچ کر ذرا ہی دستک دی تھی کہ دھومن نے دروازہ کھول دیا وہ ڈیوڑھی میں پلنگ پر دو تہی بچھا رہی تھی۔ مارٹو نے خوش ہو کر کہا:۔ آج تو تمہاری بڑی کھاطراں ہو رہی ہیں۔ دو تہی بچھائی جا رہی ہے ڈھیر سے گھی بور ے، اکھوپرے کی برتیوں اور سونے کے ورق والا شکرانہ کھلایا جاویگا۔

مرچی نے گول گول شیطانی آنکھوں میں غصہ کا کڑوا زہر گھول کر جواب دیا۔ "پھوٹ کی طروں نہ کھیل تیرے اوپر دوسری بتیا پڑنے والی ہے۔ بالن نہیں، توا کیسے چڑھے۔ جا کھرنی (رخنی) ندی پہ سے لکڑیاں چگ لا۔"

مارٹو :۔ اتنی دور سے ایسی گرمی ماں (میں) باہر نکل کے دیکھ۔ آنکھوں کے سامنے ترمرے ہی ترمرے پھرنے لگیں گے۔

مرچی :۔ تو تو آپ بھی بھوکا مریگا ساتھ ہمیں بھی مارے گا۔

مارٹو :۔ اچھا جا رہا ہوں لوٹ کے آیا تو ٹھنڈا ہریرا پلاویگی۔

مرچی :۔ پلاؤں گی۔

مارٹو :۔ آہا میرے لئے کیسی چٹی دو تہی بچھائی ہے تھوڑی دیر اِس پہ لیٹ کے دیکھ لوں۔ (وہ بیٹھنے لگا تو مرچی نے ... زہر میں بجھی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اسے پرے ہٹاتے ہوئے بولی

مرچی :۔ ہٹ رے نکٹے کے جنے! یہاں تو آج ماں سوئے گی

ڈیوڑھی ماں ٹھنڈ ہے۔

مادھو :۔ اور میں ؟

مرچی :۔ میں کہے گلے پہ چھری یہاں تو وہ ہی سویا کرے تھی۔ اب تو جو آکے دھر اگیا۔ بتا وہ کہاں جاوے ؟

مادھو :۔ تو میں چلا جاؤں ؟

مرچی :۔ بڑی کھوسی (خوشی) سے۔

مادھو :۔ تو گیل چل۔

مرچی :۔ گھر جاکے میرے واسطے پالونڑا بچھوا۔ میں آجاؤں گی۔

مادھو :۔ پالونڑا کیا ہوتے ہے۔

مرچی :۔ کچھ ہو ہے۔ جمن جاٹ کے کتے کے کان پہ چچڑیاں ایسی چمٹیں، الگ ہی نہیں ہوں تھیں پھر چمٹی میں انگاریاں لے لے کے انہیں دکھائیں تو جب جاکے نپوتیوں نے کتے کا پیچھا چھوڑا تھا۔

مادھو :۔ تو بڑی جنجالی ہے۔ میری پھبتی اڑا کے تجھے کیا مل جائے گا۔

مرچی :۔ تیری پھبتی تو بڑے بجار (بازار) ماں بھی اڑ رہی تھی۔ سارا گاؤں یوں کہے ہے گھسٹے کی بہن کو کوئی بر نہیں ملے تھا جو اس سقے کے پلے باندھ دی۔ پر یہ بھی سب کہیں ہیں بڑا گینڈا اور سقہ ہے سارے سارے دن جیٹھ کی دوپہریوں میں بہنگی اٹھاؤں پھرے

ہے۔ تھکتا نہیں ۔

ماڑو:۔ ایک تو میں تمہارا پانی بھروں ساتھ سقہ بھی کہلاؤں۔ اب میں بہنگی کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا ۔اب پانی اپنے بھائی سے بھروائے ۔

مرچی:۔ اسے تو وا جان کھائی مچھیلو نٹیں چھوڑتی، دونوں ماں (میں) ہر گھڑی کانٹے کی کشتی ہوتی رہے ہے ۔ تال سے تال ملائے رہے ہیں تو کچھی تماشا جا دیکھ ۔

ماڑو:۔ بے شرمی کی باتاں نہیں کرا کرتے ۔

مرچی:۔ ہائے ہائے، میرے بھتیا کو کیسی چھوٹی سی، چیری سی، کچوری ایسے گالوں والی، ہاتھ لپک سی لنکا ہو ملی ہے ۔جب مزے مزے لے کر کھاتا ہوگا تو چرمر چرمر بولتی ہوگی ۔

ماڑو:۔ چپ رہ ڑبولی چپ رہ !۔

مرچی:۔ وہ چپ بھی نہیں رہتی اسے تو بھولی باتاں کر کرکے اپنے لونڈے کا بھیجہ چاٹ لیا ۔

ماڑو:۔ میرا بھیجا نہ کھا ۔

مرچی:۔ تو میرے دانتی دینا چاہے ہے ؟ میں تیرے منہ پہ نیند چڑھا دوں گی ۔

ماڑو:۔ میں تیرے گپھڑے منہ میں ہاتھ گیر کے کانوں تک پھاڑ دوں گا ۔

مرچی:۔ جو میرے حماتی آگئے تو تو اپنا پوتھرا دونوں ٹنگڑیوں ماں دبائے کے چھل چھل موتتا ہوا بگٹٹ بھاگے گا ۔ وہ تیرا پیچھا کھوئی ندی تک کریں گے پھر تیرا پیچھا چھوڑ دیا جاوے گا ۔

ماڑو :۔ اب میں ضرور تجھے گیل لے کے چلوں گا، نہیں تو دھومن میری گیل چلے گی۔

مرچی :۔ وا کیوں چلے گی؟

ماڑو :۔ آٹا ساٹا جو ہوا تھا۔

مرچی :۔ جو وہ آپ نہ جانا چاہے؟

ماڑو :۔ وہ کیسے نہ جانا چاہے، وہ تو تیرے بدل (بدلے) آئی ہوئی ہے میں اسے لے کے جاؤں گا۔

یہ سنتے ہی مرچی نے اپنے شوہر کی چادر لاٹھی کواڑ کھول کر گلی میں پھینک دی۔ ماڑو انہیں اٹھانے گیا تو مرچی نے اندر سے کنڈی مار لی۔ ماڑو نے بہتیرے کواڑ پیٹے۔ لیکن اس کی بیوی نے دروازہ نہ کھولا۔

ماڑو اس مچلیکی پر بھی بیوی کا در چھوڑنے کو تیار نہ ہوا۔ اس کی بے شکیبی بہت ہی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ جو مرچی نے کچھ دن سسرال میں میٹھی پیاری بن کر اسے شرف بخشا تھا تو اسے وہی گھڑیاں یاد آتی رہتی تھیں۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ دھومن باوجود ادنی ہونے کے نگام دار ہو چکی ہے اس کی سسرال والے بد عہد تھے انہوں نے دھومن کے معاملہ میں اس کا ثبوت پیش کر دیا تھا۔ اب مرچی بدمہر اور چیری ہو گئی تھی۔ وہ جوں توں کر کے اپنی بہن کو لے جانا چاہتا تھا اور مرچی کو مجبور کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کے گھر آ کے بسے گی تو جب ہی گُلے کا بھی گھر آباد ہو گا۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ مرچی کو بڑا ہوتا جمن جاٹ

تو پسند آرہا تھا۔ اور وہ سادہ صورت ماڑو کے ساتھ بے تال تھی۔

ماڑو نے ذرا حلیمی دکھاتے ہوئے کہا " اتنی ٹیکری نہ بن۔ تو میرے ساتھ پندھرواڑے بھر ایک چھپر تلے رہ چکی ہے جب تو تو بڑی ادھین دکھائی دے رہی تھی اب تجھے کیا بادل مار گئی۔"

مرچی :۔ بادل تو اسے مار گئی تھی جسے چوڑھے بھگالے گئے تھے۔ اچھا یوں بتا دا آپ بھاگی تھی یا مُوسُوا اسے بھگا کے لے گیا تھا؟

ماڑو :۔ کیوں بتاؤں۔

مرچی :۔ جو تو بتا دیا تو تیرے ساتھ بھی تو چلی جاؤں گی۔ اچھا نہیں بتاتا ؟

ماڑو :۔ کیوں بتاؤں ؟

مرچی :۔ ارے چھوٹے بتا دے وہ مجا (مزہ) دونگی مجے ماں اِنا گڑ گڑ ہو جاوے گا۔ دیکھ یں کیسے مہما سے بول رہی ہوں میری بات کا جواب دے۔

ماڑو :۔ نہیں دیتا جو چاہے کر۔

مرچی :۔ تو جباب نہیں دیتا، یں جباب (جواب) دوں گی۔ یں تیرے باپ کو دیکھا ہے۔ جد وا یہاں آیا تھا۔ وا تو چھیلا ہے جبھی تو تیری ماں چوڑھے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

ماڑو بڑی کڑک کے وار دھوپ یں میز بانوں کے لئے بالن چگنے

چلا گیا۔ اس وقت ہوا گرم تھی۔ پر واسی ٹھنڈے پنڈول بھرے کوٹھوں میں سو رہے تھے۔ بھینسیں سورج والے تالاب میں بیٹھی ہوئی جگالی کر رہی تھیں۔ اس تالاب کے کنارے جمن جاٹ کا ٹھان تھا۔ جس کی کھڑکیاں پانی کی طرف کھلتی تھیں۔ جب ماڑو ٹھان کی طرف سے گذرنے لگا، تو جمن جاٹ کی گھوڑی ہنہنانے لگی کیونکہ اس کا مالک توبڑے میں اس کے لئے دانا لا رہا تھا۔ گھوڑی تو ہنہنا رہی تھی۔ جمن بھی اس کے ساتھ ہنہنا رہا تھا۔ اس آواز پہ ماڑو کو خیال آیا کہ جس طرح گھوڑی اس جاٹ کو دیکھ کر ہنہنا رہی ہے، مرچی اور اس کا لگماترا بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر یونہی ہنہناتے ہوں گے۔ انہوں نے تو گلے کو کنوارا نانا دیا تھا۔ لیکن اس کی بیوی تو جاٹ کے تلے دلکی چال چل چکی تھی

ماڑو نے دھوپ سے بچاؤ کے لئے سر پہ چادر رکھی ہوئی تھی۔ تپش کے کارن اسے درختوں کے پتے تک سفید نظر آ رہے تھے۔ اور زمین ایسی لگ رہی تھی جیسے خونی ندی کا ریت۔

ندی کنارے جھوؤ، جنڈ، پھر انس اور کریل ایسے بے سلاخ، سخت جان اور بے حیا درخت کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ڈٹے پن سے دھوپ اور طوفان دونوں عاجز تھے۔ جتنی دھوپ پڑتی یہ اور اکڑتے، اور جب خونی ندی کناروں پر چڑھ کر گاؤں اجاڑتی تو یہ پانی میں ڈوبے رہتے۔ جب پانی کناروں سے اتر جاتا تو یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تلنگوں کی طرح سے اکڑتے اور اتراتے۔ یہیں سے ماڑو نے سوکھی لکڑیاں،

توڑیں اور چنگیں اور ہرے پودے کے جوڑنے میں بوجھی باندھ کر سسرال دوار سے لوٹا۔

اس وقت ظہر کی اذان ہو رہی تھی، جب مارو نے مینر بالوں کے کواڑ چیتنے شروع کیے اندر سے مرچی بول رہی تھی "بہن کے گھر بھائی کتا بلکہ لینڈی کتا ۔"

مارو :۔ تو تو میری گیل نہیں چلے گی ؟

مرچی :۔ جونڈے پہ بیٹھا میری باٹ دیکھتا رہیے، سایئد (شاید) آجاؤں ۔

مارو :۔ تو مجھ سے یونہی مجھت (مفت) ماں پانی بھرواتی رہی ۔ میرے کاندھے سُوج گئے ۔ تو نہیں جاتی تو میں دھوبن کو لے کے جاؤں گا ۔

مرچی :۔ لے جا بے لے جا ، دیکھ وہ تو اپنے بنیرڑو سے پوری طرح لگ دہ گئی ہے اس کے تو پیٹ میں بھی پڑ گیا ۔ نام کی ننی، اٹھائے جائے دھنی ما دیکھت ماں سوئی ہے ، بھتیرے کوئی ۔ میں تو کچھ مہینوں ماں بھتیجے والی ہو جاؤں گی ۔

مارو :۔ تمہارا وعدہ تھا ۔ جب تک واجوان نہ ہو گی گلا نہ کاٹے گا ۔

مرچی :۔ گلا کیا رکتا وہ آپ ہی نہ رکی اور رک بھی جاتی تو بلا برتے یونہی رہتی تو پھپھوند نہ جاتی ، اس کی ماں نے تو جوڑے تک نہ چھوڑے وہ کس طرح اسے چھوڑ دیتی پھیر میرا بھائی بھی کھنجڑی بجانے لگا ۔ تو نے

کبھی ان دونوں کا رَٹکلا نہیں سُنا ؟

مارٹو :۔ مجھے تو کبھی دھومن کی آواج (آواز) تک نہیں سنائی پڑی۔ جو تیں میرے گھر نہ بسی ہیں اسے بھی یہاں نہیں بسنے دونگا۔

مرچی :۔ دا (وہ) اپنے کھاوند (خاوند) سلامت کی بدوں اجاجت (اجازت) تیرے ساتھ نہیں جائے گی۔ تیرا کھوچڑ پن ان کی ملنساری کو نہیں توڑ سکتا۔

مارٹو :۔ میں اس کی گردن مروڑ دونگا، دا پیلیے (پہلے) مہاری ہے پھیر کسی ہور (اور) کی، اچھا یوں تو بتا تیں کیوں میرے ساتھ نہیں جاتی۔

مرچی :۔ میں تیری گیل جب جاتی جو میں کوڑھن ہوتی۔

مارٹو :۔ جب کیوں جاتی ؟

مرچی : پھر لوگ کہتے، رام ملائی جوڑی ایک اندھا ایک کوڑھی۔

مارٹو :۔ میں کوئی اندھا ہوں ؟

مرچی :۔ کوئی آنکھوں کا اندھا کوئی ہے کا اندھا جو تو اب اس گھر ماں پڑنے کی کوشش کی تو مارے کھونسڑوں کے سر ہرٹے کے ڈنڈ ما لیا ہو جائیگا۔

مارٹو :۔ تو تم دھومن کو کتر بھید سے بیاہ کر لائے تھے۔ تم نے ہمیں کھوب (خوب) روٹا۔ ہم نے بہن کی بہن دی۔ ساتھ کھونسڑے کے کھونسڑے کھاویں گے۔

مرچی :۔ اگر دھنتے ہیں تیرے سر ہاں کھونسڑے سڑے ہوئے جوڑے

ماں بھگو بھگو کے ماروں گی۔ تیرے برہمانڈ ماں گل میکھ ٹھوکونگی تیرا رہا۔ یہاں کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا۔

ماڑو :۔ میں دھومن کو لے کے جاؤنگا۔ جو تو مجھے چھوڑ رہی ہے دھومن کو بھی اپنا کھاوند چھوڑنا پڑے گا۔ جو وہ نہ گئی میں اس کی لھاس (نعش) یہاں چھوڑ کے جاؤنگا۔

اب ماڑو نے چونے سے بکٹیاں نکال نکال کر کواڑوں پر مارنی شروع کر دیں۔ گاؤں والے جمع ہو گئے۔ کوٹھے پر کھڑی ہوئی اس کی بہن کہہ رہی تھی "بھائی یہاں سے چلا جا۔ میں تیرے ساتھ نہیں جانے کی۔" یہ الفاظ اس کا شوہر اسے ڈرا کر کہلوا رہا تھا۔ اب ماڑو نے اپنی بہن کے مارنے کے لئے کوٹھے پر بھی بکٹیاں پھینکنی شروع کر دیں۔

پھر ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا۔ مرچی اور اس کا بھائی باہر نکلے۔ وہ گلیاری میں بکھری ہوئی بکٹیاں اٹھا اٹھا کر ماڑو کے مارنے لگے۔ کوٹھے سے مرچی کی ماں بکٹیاں اور ڈھیلے اس کے مار رہی تھی۔ اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی بہن ایسا کر رہی ہے۔ پھر گلا اور ماڑو گھتم گتھا ہو گئے۔ اس کے بعد ماڑو نے اپنے سالے بہنوئی کی پچھی بھر کر تپتی گلیاری میں ڈھا دیا۔ گلے کی باری اوپر آنے کی کبھی نہ آ سکتی تھی کیونکہ یہ چھلو سا تھا اور ماڑو گینڈا را۔ نے بھینسے ایسا۔ لوگ کھڑے دیکھ رہے تھے۔

پھر گمیا چھنت بھر میں مرچی ہتھوڑی اٹھا لائی اور اس نے اپنے

شوہر کے سر پر وار کرنے شروع کر دیئے۔ ماڑو چوٹوں سے بلبلا اٹھا۔ وہ پھر بھی مارتی ہی جا رہی تھی۔ اب گلا مہمان کے اوپر آ کر اُس کی گدی بچا رہا تھا۔ ماڑو کے بال اور گردن خون سے لال ہو رہے تھے۔ اتنے میں دھوبن بھی آ گئی جس نے نند کے ہاتھ سے ہتھوڑی چھیننی چاہی۔ مرچی نے اسے ڈیوڑھی میں دھکیل دیا جہاں دھوبن نے اپنے ناخنوں سے نند کے چہرے کی کھال بلور دی تھی، اور مرچی نے دھوبن کا ہاتھ بری طرح مروڑ دیا تھا۔ پھر مرچی اندر سے گل میخ لے کر گلیارہ ی میں آ گئی۔ اس نے دھوبن کو روکنے ئیے باہر سے ڈیوڑھی کا کنڈا لگا دیا تھا۔

جب مرچی نے اپنے شوہر کے سر میں ہتھوڑی سے گل میخ ٹھوکنی شروع کی تو وہ اس طرح سے اڑانے لگا جیسے پولیس تھانے کو بار بار کر چوری کے مال کا پتہ پوچھ رہی ہو۔ دھوبن اپنا سر کواڑوں میں دے دے کر مار رہی تھی اور رو رہی تھی۔

لوگ ماڑو کو چھڑانے لگے اور کسی نے مرچی کے ہاتھ سے ہتھوڑی بھی چھین لی تو وہاں جمن جاٹ آ گیا۔ اس نے پھر ہتھوڑی مرچی کے ہاتھ میں تھما دی۔ اب وہاں مسجد کا پیش امام بھی پہنچ گیا۔ اس نے مرچی سے ہتھوڑی لے کر گاؤں کے کوٹھوں پہ دور پھینک دی اور گلے کو ماڑو کے اوپر سے ہٹا دیا۔

تھوڑی دیر بعد ماڑو کو ہوش آ گئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مرچی

اس کی چادر اور لاٹھی لے آئی ۔ وہ چادر سر پر رکھے لاٹھی ٹیکتا ہوا اس ٹٹو کی طرح سے جا رہا تھا جس کے پیر سوج کر ان میں پانی پڑ گیا ہو۔ ہرچی اسے سنا رہی تھی ۔ دیکھ لو! پچھیت یوں چلا کریں ہیں ۔" پھر وہ ٹھسکا دکھاتی ہوئی ڈیوڑھی میں چلی گئی ۔

۳

لوٹی باس پہنچ کر مادھو نے اپنی بپتا باپ کو سنائی تو وہ رونے لگا۔ باپ کو اس سے زیادہ تکلیف ہوئی کہ دھومن نے جسے ابھی اچھی طرح سے اوڑھنی اوڑھنا بھی نہیں آتا تھا جو اس کی اتنی میٹھی پیاری بنا کرتی تھی ۔ جس کا منہ اسے "بڑے بھائی" کہتے ہوئے سوکھا کرتا تھا، اس نے اپنے بھائی کی طرف سے کیسی آنکھیں پھیر لیں ۔ اس نے تو کوٹھے پر کھڑے ہوتے بیچارے بھائی کے لکڑیاں اور ڈھیلے تک پھینک پھینک کر مارے تھے اور اسے کہا تھا " یہاں سے چلا جا ۔ میں تیرے ساتھ نہیں جانے کی ۔" بھائی اتنے دن وہاں پانی بھرتا رہا ، لیکن بہن نے اس سے نہ کبھی بات کی ، نہ کھانے کو پوچھا ۔ جب اس کے سر پر ہتھوڑے پڑ رہے تھے اور منہ پھٹو کی جا رہی تھی دھومن نے یہ تک نہ کیا تھا کہ اپنی نند کا ہاتھ ہی آ کر پکڑ لیتی ، جب بڑوں میں جمع ہوا ۔ اور وہ بہو کو پوچھنے لگے تو مادھو نے پٹ سے کہہ دیا ۔ "وا تو بڑے رجیلے

نکلے، دھومن کو بھی رکھ لیا، ہو بہو کوئی نہیں بنتے۔

جس طرح سے شہاب الدین غوری کو پرتھوی راج کے ہاتھوں شکست کا احساس رہتا تھا اور جب تک اس نے تراوڑی کے میدان پر پرتھوی راج اور کھانڈے راؤ کو شکست نہ دے دی، وہ چین سے نہ بیٹھا، یہی حال ماڑو کا تھا۔ اسے ہر وقت اپنے سر میں میخ سی ٹھکتی ہوئی معلوم ہوا کرتی اور دھومن کا یہ فقرہ "یہاں سے چلا جا، میں تیرے ساتھ نہیں جاتی کی" اس کے دماغ کو مختل کئے رکھتا۔ ان کی چھوٹی سی چھریری سی چیز کو تو ایک بن مانس دن رات پٹ پرت کر ٹوٹی ہوئی لڑھیا بنائے دے رہا تھا۔ اور اسے اپنی بیاہتا کے چھنگلی تک لگانے کی اجازت نہ تھی۔ وہ اس کے ہر وقت کھرنڈے ہی مارنے کو تیار رہتی تھی۔ نہ اسے کبھی ڈھنگ کا کھانا دیا تھا، نہ ڈھنگ کا بچھونا۔ اس نے گلیاریوں میں جاگ جاگ کے کتنی راتیں اس کے انتظار میں ٹیر کیں۔ لیکن اسپر دن بدن جنون ہی چڑھتا گیا تھا۔

ایک مرتبہ ماڑو پنجاب کے کسی شہر میں گیا تھا۔ وہاں طوائفوں کو شہر سے نکالنے کی تحریک چل رہی تھی۔ عوام نعرے لگا رہے تھے۔ "ہُن کنجریاں نوں شہر وچ نئیں رہن دیاں گے"۔ ماڑو دل دل میں ہر وقت یہی نعرہ لگاتا رہتا "اب دھومن کو وہاں نہ رہنے دونگا۔ اب دھومن کو وہاں نہیں رہنے دونگا"۔ اس نے یہاں تک ٹھانی ہوئی تھی کہ جو وہ اسے ساتھ نہ لا سکا تو اس کے پران چھڑا کر آئے گا۔

ماڑو نے اپنے ارادوں کی بھنک اپنے باپ کے کانوں تک نہ پہنچنے دی کیونکہ وہ اپنی لڑکی سے بہت پیار کرتا تھا۔ ماڑو کو بھی اپنی بہن سے الفت تھی۔ اسے وہ سمے یاد آنے لگے جب دھومن بچپنے میں دبلی اور کمزور سی لڑکی تھی۔ یہ اُسے خطا پر مارتا تو وہ مار سہتی اور روتی رہتی، کسی سے شکایت نہ کرتی، مشہور ہے کہ کوئی اوائل طفلی میں کیسی ہی رہی ہو، شباب کو چڑھ کر بس کی پڑیا بن جاتی ہے۔ دھومن نے ابھی شباب کی ڈیوڑھی میں آدھا قدم رکھا تھا لیکن وہ بدستور ویسی ہی تھی۔ کونپل گری سی، عناب کے پتوں کی طرح سے سرنگوں سی، حکم بردار سی، کاغذی اور ابلا، وہ اس طرح سے پھونک پھونک کے قدم رکھ کر چلتی تھی جیسے اس نے ہوائی چپل پہنے ہوتے ہوں۔ میکے والوں میں وہ میکے والوں کی آگیا میں تھی۔ اور اب سسرال والوں کے تصرف میں۔ ماڑو کو اپنی بہن کی اس طبیعت کا احساس نہیں تھا۔ وہ ایسی گائے تھی جو قصائی کے آگے آگے کمیلے تک بلا ہانکے جائے۔ اس کے بھائی کو یہ صاف سجھائی دے رہا تھا کہ گگُے سے بدلہ لینے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ جس طرح سے اسے مرچی سے محروم کر دیا گیا تھا وہ بھی اپنے دشمن کو دھومن سے محروم کر دے۔

آساڑھ کا چاندنا پندھرواڑہ ختم ہو کر اندھیر لگ چکا تھا۔ آسمان سے آگ برس رہی تھی، زمین سے شعلے نکل رہے تھے۔ بستیوں سے باہر عیدگاہوں میں بارش کے لئے دعائیں مانگی جا رہی تھی۔ بہت سے

پیڑ خشکی کے مارے سوکھ گئے تھے اور آموں کی امبیاں ٹھگر ٹھگر کر گر رہی تھی۔ جب مارٹو ایک تیز کلہاڑی سنبھال کر گنجیر والی چلا کہ دھومن کو قتل کر کے سسرال سے اپنی محرومی کا بدلہ لے۔

جب وہ غلام غفار خاں کے باغ کے پاس پہنچا جو موضع محی الدین پور کے نکال پر تھا تو اتر سے اٹھے کالے گھنگھور لپرے کے لپے آسمان کی بانت بھرتے ہوئے آ گئے۔ ہوا کی لین ڈوری ان سے پہلے ہی آ گئی تھی۔ کھیڑے کی ڈوب چگتے ہوئے مویشی آمد طوفان سے ڈر کر گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ گھاتی گیدڑوں نے تالاب کنارے کھڑی ہوئی بطخوں میں سے دو کو پکڑ لیا تھا۔ یہ پکڑی ہوئی بطخیں اور دوسری بطخیں زور زور سے چلّا رہی تھیں۔

اس وقت مارٹو کو دھومن یاد آ گئی کہ جس طرح سے بطخیں گیدڑوں کے زخموں سے چور ہو کر چلا رہی ہیں، اس کی چھوٹی بہن کلہاڑی کے زخموں سے اسی طرح چلائے گی۔ پھر یک لخت اس کا سر پیر اٹنے لگا جس پر صرف دھومن کی وجہ سے ہتھوڑیاں پڑی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کے سر میں اب بھی گل میخ ٹھونکی جا رہی ہو۔

پھر وہ سوچنے لگا کہ جب رات کو گھنگھور برسیگے، بگ ٹٹ بہتے ہوئے ندی نالوں نے شور مچایا ہوا ہوگا، کھنک کے زور سے پیڑ ڈھے ہوئے جا رہے ہوں گے، برسات کی گنجار سے خونی ندی کے کناروں والا ہر گاؤں جاگ رہا ہوگا کہ کیا خبر کب طوفان کا پانی بن بلائے مہمان کی طرح

بے ور ماں گھروں میں گھس آئے تو ایسے میں گلّا تو اپنی بیوی کو لوپسا رہا ہوگا۔ مرچی جمن جاٹ کے ساتھ سروج والے تالاب پر رتھان میں انہنا رہی ہوگی۔ اور وہ خود اسی گلیاری میں بھیگتا پھر رہا ہوگا جہاں اس کے سالے بہنوئی نے اس کی رگڑائی کی تھی اور دھومن نے کوٹھے پر کھڑے ہوئے یہ ماجرا تماشے کی طرح دیکھا تھا۔

عشا کے دو گھنٹہ بعد ماڑو گنجر والی کے مدخل پر موجود تھا۔ اس مدخل کے شمال میں کچی سڑک کے ٹیڈی کنارے ایک باغیچی تھی جس کے حاشیہ میں پٹ بیجنے جھلملا رہے تھے۔ سروج والا تالاب اور جمن جاٹ کا رتھان بھی اسی طرف تھا۔ اس رتھان کی دو کڑیا ہال نما ڈیوڑھی میں گیس کی لالٹین ٹنگی ہوئی تھی۔ گاؤں والے جمع تھے جمن جاٹ جنگ نامہ خیبر ڈھولک کی تھاپ پر بطرز آلہا پڑھ رہا تھا۔ کئی سننے والے جنگلی حال میں ناچ کود رہے تھے۔ ماڑو نے پیاؤ کی چھپریا میں ہی کھڑے ہوئے ایک پتھر گیس کی لالٹین پر پھینک کر مارا جس سے لالٹین ٹوٹ گئی اور مجمع درہم برہم ہوگیا۔

اس کارستانی کے بعد ماڑو گاؤں میں داخل ہوگیا۔ برسات کی رات گنجار رہی تھی۔ سوائے پٹ بیجنوں کی کھلتی مندتی روشنی کے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مگر گھٹاؤں کے جھونک میں بجلی بار بار جھلملا رہی تھی۔ گلیاروں میں کہیں تگڑ ہی تگڑ ہی تو کہیں گھٹنوں گھٹنوں تک پانی ہلوریاں سی لیتا ہوا چل رہا تھا۔ بارش ہلکی ہلکی ہو رہی تھی۔

پھر مارڑو سسرال کے دروازہ پہ پہنچ گیا تھا۔ اسے اندر جانے کی کوئی سبیل سجھائی نہیں دے رہی تھی کہ یک لخت گویا جادو کے زور سے ڈیوڑھی کے کواڑ کھل گئے۔ اس کی بیوی جمن جاٹ کے پاس جانے کے لئے گھر سے نکل رہی تھی۔ مارڑو نے اسے دروازہ ہی میں دبوچ لیا اور ڈیوڑھی میں بچھی ہوئی چارپائی پہ لے جا کر اس کی پامالی کر دی۔ یہ رضامندی کا معاملہ نہیں تھا۔ مرچی پھڑپھڑا رہی تھی اور مارڑو پگلا رہا تھا۔ جبھی کھلے کواڑوں میں سے کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ جمن جاٹ اپنی محبوبہ کو لینے کے لئے پہنچ گیا تھا۔ اب باہر بڑے ہی زور سے بارش شروع ہوئی تھی۔

جمن جاٹ نے جو ٹارچ کی روشنی میں گھمسان سا ہوتے ہوئے دیکھا، تو اس نے مارڑو کی کوکھ میں زور زور کے ساتھ پھوہی کی طرف سے لاٹھی کی کھودیں مارنی شروع کر دیں۔ مارڑو چوٹ سے بلبلا اٹھا اور مرچی بھی نجات پا کر پاس ہی لیکن دو لوک کھڑی ہو گئی۔ جمن جاٹ اور مرچی دونوں گھوڑا گھوڑی کی طرح سے ہنہنا رہے تھے۔ پھر جمن اور مرچی نے مارڑو کو بارش میں دھکیل دیا اور کنڈی بند کر کے الول کلول میں مشغول ہو گئے۔

مارڑو باہر گلیاری میں بھیگ رہا تھا جو پانی سے بھری ہوئی چل رہی تھی۔ پانی اس کے گھٹنوں تک آ رہا تھا۔ بارش کے شور میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ جب پانی ٹھہر گیا۔ تو کواڑ کھلے جمن جاٹ مرچی کو اپنے رتھان سروج والے تالاب کنارے لے جا رہا تھا۔ ڈیوڑھی کے

کو اب صرف ۔ ڈھکا دیئے گئے تھے ۔

مارڈو آیا تو تھا کلہاڑی لے کر اپنی بہن کا خون کرنے لیکن اس نے جو اپنی بیاہتا کی ترکی تمام ہوتے دیکھی تھی تو اسے سخت اشتعال ہو گیا تھا۔ اس نے گھنٹہ بھر تک بڑے زور کی بارش اپنے سر پر لی تھی۔ اس لئے جب بسیوا اور لکھا ترا باہر نکل کر تھوڑی سی دور چلے تو مارڈو نے بجلی کی چمک و تک روشنی میں جمن جاٹ کی گدّی پر کلہاڑی کے کئی وار پے در پے کئے اور گردن دھڑ سے جدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مرچی شور مچا ہی تھی۔ اس سے پہلے کہ لوگ جمع ہوتے مارڈو نے اپنی بیوی پر بھی حملہ کر دیا۔ وہ اپنے شوہر کی کلہاڑی سے ایسی شدید زخمی ہوئی کہ اسے اٹھا کر لے جانا پڑا۔

اس افراتفری میں دھمن بھی گھر سے غائب ہو چکی تھی۔ اس کا شوہر اسے بستر میں تنہا چھوڑ کر بہن کی مدد کو بھاگ آیا تھا۔ پھر ان دونوں بہن بھائی کی بابت کسی نے کچھ نہ سنا ۔

باجے والا

جاڑے نے پیر پٹن شروع کر دی تھی۔ شفتالو ناشپاتی کے پیڑوں پر پتہ تو نہ تھا۔ لیکن شاخیں پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ شیام نہر کی پٹڑی کنارے سیمل پھول رہا تھا اور بیر ساقی ندی کے شرق میں ریت کے سفید سفید تودوں سے آگے ڈھاکہ۔ ساڑھی پکانے والی خشک اور تیز ہوا جھکورے مارتی گرد اڑاتی دن دن بھر چل رہی تھی۔ آموں پر بور آنا شروع ہو گیا تھا۔ ڈیک پر سوکھی ہوئی نمکوبیوں کے گدشے ہرے ہرے تازہ تازہ پتوں اور سفید پھولوں میں عقد ثریا کو مات کر رہے تھے پلکھن پر سرخ سرخ پتوں کی بہار تھی ننگی ننگی سرسوں کی زرد زرد خشک ٹٹار اور لمبی لمبی پھلیوں سے شیطانی جھنجھنے بج رہے تھے اور ایسے وقت میں موضع کندن والہ کے سابق نمبردار کی بیٹی نساء کو قدرت کی یاد آ رہی تھی کہ "آئے ہائے رے میرے جی! جیدیں نے اُنتوں پہلوں پہل دیکھا تو اس کے اوپر والے ہونٹ پہ بالوں کی یوں ہی تھوڑی سی کالک ہو گی۔ جو کوئی اول اول پاپ کرن لاگے تو اس کے دل پہ بھی ایسی ہی سیاہی رمکتے در مقنے) دمکنے لگتی ہو گی۔

اب سے آٹھ سال ہوئے بیساکھ کا مہینہ تھا اور کندن والا میں، منسہ پور سے چوراسی ٹ بنیوں کی بارات آئی ہوئی تھی جس میں رتھوں بہلیوں اور ہاتھی کے ساتھ انگریزی باجہ بھی تھا۔ انہیں باجے والوں میں سے قدرت کے ہاتھوں میں ایک لمبی کالی نفیری تھی، جب وہ اسے بجاتا تو اس کے گال جن پر ابھی بال نہ تھے کچھ ہتھوڑے سے پھول جاتے اور گھگرے ساڑھی پہنے والی بنیوں کی لڑکیاں مندر مسجد چھوڑ کر اس گاؤں کی واحد پکی عمارت کرتا سیٹھ کی چوبارہ والی حویلی پہ کھڑی ہوئی پہلے تو سوچتیں کہ وہ ہمیں بھی باری باری سے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر مست ہو ہو کر ہل ہل کے بجائے اور کہتیں "اے سکھی! یو پنچھی کہاں سے آیا آؤ اس کے پھولے پھولے گالوں پہ ہاتھ کی تھپتھپی ہتھیلیاں مار مار کے سُر نکالیں، پیں پیں پیں، پیں پیں پیں، بنیوں کی ساڑھی گھگرا پوش لڑکیوں کے پاس ہی نمبردار کی بیٹی نسا بھی کھڑی تھی۔ جو یہ بانی کا لفظ لے اڑی، پیں پیں پیں۔

اور سخی نائی کی چرچری چھوکری بھاؤ بتاتے ہوئے ٹھمک پہ گانے لگی ؎

بانکی رے بانکے مجھے تیری چاہنا
تیری چاہنا میری چاہنا، تیری چاہنا
بانکے رے بانکے تجھے میری چاہنا
میری چاہنا، میری چاہنا میری چاہنا
آ ہم دونوں نین ملادیں

ہاتھ ملا کے گات ملا دیں

گات ملا کے من ٗمن ٗمن ٗمن،

بانکے رے بانکے مجھے تری چاہنا

بانکے رے بانکے تجھے میری چاہنا

میری چاہنا میری چاہنا میری چاہنا

بانکے رے بانکے تجھے میری چاہنا

مجھے تری چاہنا تجھے میری چاہنا

نسا پیں پیں کرتی ہوئی گھر لوٹی تو اس کی ماں نے پوچھا "بے وحدت! یہ کیا چڑی کی طرح بول رہی ہے؟" اس نے اس کا جواب ابھی پیں پیں سے دیا

سندپور سے آئی ہوئی چوراسر ٹ بنیئوں کی بارات کندلا والے ہیں رات کی رات ٹھہر کر اگلے دن دوپہر بعد رخصت ہونے والی تھی عشاء کی نماز کچھ دیر ہوئے ہو چکی تھی جب نسا کا بڑا بھائی مخمول قسمت کو لئے ہوئے گھر آیا۔ نسا ان دنوں فاختہ کے اس بچے کی طرح تھی جس کی گردن کے کچھ کچھ بال پر برابر ہونے سے رہ گئے ہوں اور چونچ ابھی تک صاف نہ ہوئی ہو۔ قدرت نے باجے والوں کی وردی پہنی ہوئی تھی جس میں وہ نسا کو تھانیدار سا معلوم ہوا تھا۔ وہ اس کے بالکل نزدیک آکر شرارتی آنکھیں نچاتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں "پیں پیں، پیں پیں پیں پیں، پیں۔" کرنے لگی۔ ترشے ترشے ہونٹوں سے ادا ہوتے

ہوئے یہ الفاظ ایسے سہانے لگتے تھے جیسے کوئی بھور جیڑیا چہچہا رہی ہو۔ قدرت کو نسائی کے یہ طور اچھے نہ لگے وہ تو خوش آمدید کہنے کی بجائے گویا اس کے پیشہ کی اور خود اس کی دھول اڑا رہی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی اس کے بے ساختہ پن پہ ہنس پڑا اور اپنے مدہم رنگ چہرے میں سفید سفید دانتوں کی لڑیاں نظارہ کے لئے پیش کر دیں۔

نسائی نے قدرت کے لئے کرسی نما پیڑھا لا کر بچھایا تو اس کی طبیعت کچھ ہلکی سی ہوئی کہ اس دختر کی میزبان نے اس کا آدر کیا ہے۔

قدرت، نسائی، مخمول، شرق رویہ سہ دری کے اندر بیٹھے ہوئے تھے جس میں تیرس کی چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ ماں جنگلے دار کھڑکیوں والے پچھلے کوٹھے میں پڑی درد سر سے کراہ رہی تھی اسے تپ لرزہ بھی ہو رہا تھا۔ پھر مخمول ماں کے لئے درد سر کی گولیاں لینے کے لئے منگت عطار کی دوکان پہ چلا گیا اور نسائی اندر جا کر ماں کی کنپٹیاں دبانے لگی۔ تھوڑی دیر میں اس نے سوچا وہ تو سہ دری میں اکیلا (اکیلا) بیٹھا ہے میں تو اسے پھر کھچا کر آؤنگی یہ خیال عملی جامہ پہننے میں اتنا سخت بے تاب ہوا جیسے بسمل گھنٹا بھرنے کے لئے پانی مانگے۔ وہ اس طرح سے اٹھ کر برآمدہ میں گئی جیسے جہانگیر نے انصاف کا گھنٹہ سن لیا ہو۔

تیرس کے چاند نے پورا کھیت کیا ہوا تھا، سہ دری میں دودھ سی چاندنی کھیل رہی تھی۔ انگنائی میں کھڑی ہوئی جامن پہ دو رت چڑیاں باری باری سے بول رہی تھیں۔ نسائی نے اپنے ہونٹ پچکارنے کی طرز میں آگے

بڑھائے اور قدرت کے منہ کے سامنے منہ کر کے کہا "پیں، پیں پیں
وہ کرسی نما پیڑھی سے اٹھا اور نسا کو سزا دینے کی خاطر دونوں ہاتھوں
میں اٹھا کر اپنی گودی میں بٹھالی۔ قدرت اُس کے ہونٹ جوش جنون
کے ولولہ اور سختی کے ساتھ چومے چومے جا رہا تھا۔ نسا کسمسا رہی تھی
پھر قدرت نے اُسے زمین پر کھڑے کر کے کہا۔ پیں پیں، پیں، یعنی وہ
نسا سے بدلہ لے چکا تھا۔ اور نسا کو بھاؤ بتا کر گا رہی تھی

بانکے رے بانکے ۔ مجھے تیری چلبلا

جب دن ڈھلے مندپور کی بارات رخصت ہو کر چلی اور انگریزی
باجہ چوباروں والی حویلی کے سامنے پہنچا تو بنیوں کی ساڑھی گھگرے پہننے
والی لڑکیاں حویلی کے کوٹھے سے قدرت کو دیکھ رہی تھی۔ نسا کی ماں کو
آج بھی تپ لرزہ چڑھا ہوا تھا لیکن اس کی بجائی اسے بکتی جھکتی کو چھوڑ کر
گلیارہ میں تماشہ دیکھنے آگئی تھی قدرت اسے کرتا سیٹھ کی حویلی کی بیل بوٹے
دار چھوٹی سی پہلی نما محراب میں مندر کی مورتی کیطرح کھڑی ہوئی دیکھ
رہا تھا ایسی محرابیں ڈیوڑھی کے پھاٹک میں دونوں طرف تھیں۔ نسا تو
صرف تماشہ دیکھنے آئی تھی لیکن قدرت یہی سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے ہونٹ
پچکارنے کی طرز میں آگے کو بڑھائے اسے چڑانے کو "بیں، ما پیں" کر رہی ہے۔

۲

نسا کچھ دن بعد ہی قدرت کو بھول گئی، باراتوں میں جو باجے

آتے اس نے انہیں سن کر بھی کبھی اسے یاد نہ کیا۔ یوں ہی تین سال گذر گئے۔ پھر اس کا چہرہ سرخی پاؤڈر لگائے بغیر ہی لال لال ہو گیا۔ سینہ کی دونوں نوکیلی رفعتیں انگیا کی کٹوریاں اور قمیص پھاڑ کر سرے باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگیں اور نچلی نچلی آنکھوں سے رنگ فتنہ گری ٹپکنے لگا... تو اس کے ابلتے ہوئے جوبن کی سب سے زیادہ سیک سوتیرے بھائی مخمول کو پہنچی۔ ان دونوں کی ماں ایک تھی باپ دو۔ مرحوم نمبردار نسائی کی ماں کو "دیبی کے میلے سے اغوا کر کے لایا تھا۔ وہ خانہ بدوشوں میں سے تھی۔ جنہیں انگریزی میں جپسی کہتے ہیں۔ یہ مردار خور قوم گیدڑ لومڑی تک کا شوربہ کھاتی تھی۔ اور ان میں سگے بھائی بہن تک جنسی طور پر آپس میں آلودہ ہو جاتے تھے۔ سگے بھائی بہن میں شادی بھی ہوتی تھی۔

مغویہ نے نمبردار کے ساتھ آتے ہی کندن والے میں اسلام قبول کر لیا اور نمبردار کے مرنے کے بعد جب مخمول اپنی ماں کے پاس پہنچا تو اسے بھی گاؤں کی واحد مسجد کے ملاں نے کلمے پڑھا دیئے یہ نوجوان خانہ بدوشوں سے تو قطعی کٹ گیا تھا۔ اور نمبردار کی ذات برادری بھی اسے ناطہ دینے کو رضامند نہ تھی۔ اب اس کی نگاہ تھی تو صرف نسائی پر۔ خانہ بدوشوں کے رواج کے مطابق تو یہ رشتہ مباح تھا ہی لیکن گاؤں کے ملا نے فقہ کی کتاب دیکھ کر فتویٰ صادر کر دیا تھا کہ دو مختلف باپوں اور ایک ماں کے بہن بھائی بیاہے جا سکتے ہیں۔ مخمول اور نسائی کی ماں ایک تھی باپ دو نسائی کا باپ نمبردار تھا۔ مخمول کا خانہ بدوش۔

نمبردار نے اپنی زندگی میں کبھی مخمول یا اپنی بیوی کے دوسرے رشتہ داروں کو نسا کی ماں سے نہیں ملنے دیا۔ اس نے اپنی لڑکی کے دل میں ان کی طرف سے حقارت بلکہ گھناؤ پن ڈال دیا تھا۔ اس لئے گو مخمول نے نہا دھو کر کلمہ پڑھ لیا تھا۔ نسا پھر بھی اس سے اس طرح کتراتی تھی، جیسے اچھوت سے برہمن۔ اس نے ان برتنوں کا استعمال ترک کر دیا تھا جو مخمول کے استعمال میں آتے تھے۔ جب انہیں ساتھ رہتے کئی برس گذر گئے تو چھوت چھات تو تقریباً اڑ گئی مگر حقارت اور گھناؤنے پن کے جذبات فرو ہوتے ہوتے بھی پوری طرح سے فرو نہ ہو سکے تھے مخمول اسے سنبھالنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ لیکن وہ ہنستی نہ تھی وہ اسے اس لئے بھائی کہہ کر پکارا کرتی تھی کہ بھائی ہونے کے سبب ان میں رشتہ ازدواج قائم نہ ہو سکے اس نے ملا کا فتویٰ تسلیم نہ کیا تھا۔ مخمول شاید چسکے لینے کے لئے نسا پر دست درازی بھی کر بیٹھتا لیکن اسے زہر باد کی بیماری ہو گئی تھی اور وہ نحیف و زرد ہو گیا اس طرح سے نمبردار کی یتیم لڑکی محفوظ ہو گئی تھی۔

پھر انہیں دنوں جب مخمول کو نسا کے جوبن کی سینک پونہچنی شروع ہو گئی تھی چھم چھم چھما چھم ساون آیا اور ہریالی کچے کوٹھوں کی چھتوں منڈیروں چڑھ گئی۔ اتر دشا سے ول بادل امنڈ گھمنڈ کر آیا اور ایسا جھلکا جیسے پکھالوں پانی پڑنے کو تیار ہے، تر پا تو منہاری کی انگنیا میں کھڑے ہوئے نمو اپر جھڑ دے پڑے۔ مہرولی (دہلی) کی لڑکیوں نے جن کے خاندان

ہندو مسلم فسادات میں اجڑ کر گندن والے آ گئے تھے۔ گیت گا رہی تھیں۔ گیت عہدِ شاہجہانی کی مغل رہن کا اپنے محبوب کی جدائی میں نوحہ تھا۔ یہ محبوب دکن میں مرہٹوں اور بیجاپور کے عادل شاہ کے خلاف برسرِ آزما ہو گا۔ گیت کے کچھ بول تھے ع

شاہ جہان سے کوئی کہہ دے۔ ناصر کو کیوں رن پر بھیجے
سبزے کا آغاز ہے جس کے " " " " " "

بیجاپور پہ ہل چل جائے عادل شاہ کا گھولٹ جائے
شاہو دی پکسٹر آئے ناصر کو کیوں رن پر بھیجے

رن میں جب تم لڑنے جاؤ بانکے پن بن خوب بجاؤ
یاد ہماری دل پہ لاؤ!!! ناصر کو کیوں ۔ ۔ ۔ ۔

کوٹھوں پر جب بادل چھائے پنجرے میں پنچھی اڑ آئے
رین اندھیری ہم کو کھائے ناصر کو کیوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ بول سن کر نسائے کے دل میں چوٹ سی ابھرنے لگی اسے فارت ایسا یاد آیا جیسے اس کے دم پر بن گئی ہو وہ سوچنے لگی جس کسی نے اسے یہاں آنے سے روک رکھا ہے۔ خدا اسے نشٹ کر دے سامنے

وہ سماں یاد آنے لگے جب قدرت نے گودی میں بٹھا کر جوشِ جنون کے دلولے اور سختی کے ساتھ اسکے ہونٹ چومے چوسے تھے۔ اس طرح سے اُسے کسی نے نہ چوما تھا۔ نہ وہ اس طرح سے کسی کی گود میں بیٹھی تھی۔ اُسے یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ ممّول کو دردِ سر کے لئے منگت عطار کی دوکان سے گولیاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ جو ماں کی کنپٹیوں کو اس دن قدرت داب دیتا تو ساری عمر بھی ماں کے سر پہ کبھی دھمک نہ ہوتی، البتہ دابنے والے کے لئے البر حلوائی کی دکان سے مٹھائی منگوانے میں کچھ مضائقہ نہ تھا اور جو وہ مجھے اپنے دونوں ہاتھوں میں نفیری کی طرح سے اٹھا کر بل بل کے بجاتا تو میں مگن ہو ہو جاتی۔ جب بارات رخصت ہو رہی تھی۔ باجہ بجتا ہوا جا رہا تھا تو میں پہلی ایسی محراب میں مورتی کیطرح سے کھڑی ہوئی ہوتی اس وقت تو سارے باجے بند ہو جاتے اور صرف قدرت ہی اپنی نفیری بجاتا رہتا اور میں ہمیشہ اسے وہیں کھڑی ہوئی دیکھتی رہتی۔

اگلے دن صبح سے بوندا باندی ہوتی رہی تھی دن ڈھلے مینہ تھما ہوا تھا لیکن بادل گھیر گھیر کے جمع ہو رہے تھے وہ شرق رویہ سہ دری سے اٹھ کر کوٹھے کی جنگلے دار کھڑکی سے گلیارہ دیکھنے لگی۔ قدرت رزاق کمبوہ سے آم خرید رہا تھا! اس کی آنکھیں بار بار جنگلے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ وہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی ملازم مالک سے روٹھ کر چلا جائے اور اسے نوکری نہ ملے تو وہ مالک کے دروازہ کے سامنے ادھر ادھر ٹہلے کہ شاید مالک

لے سے بلا لیگا۔ نسا کے دل میں اسے دیکھتے ہی خوشیوں کے انار چھوٹنے لگے۔ اسے قدرت پر رحم آنے لگا کہ یہ کیسا بے آسرا بے آسرا پھر رہا ہے وہ اسے آواز دینے کو تھی لیکن اس لڑکی کو اس کا نام یاد نہیں رہا تھا۔ پھر وہ پکارنے لگی "ارے باجے والے" یہ آواز سنتے ہی اس کی ماں آ گئی جس نے جنگلا بند کر دیا نسا کی آواز ایسی خفقانی تھی جیسے اس کا جی بھر آیا ہو۔ ماں نے تیر بھر کے پوچھا، سڑک چلتوں کو پکارنے لگی۔ یہ کون تھا؟

"بھائی کا آڑی۔" "تیں اسے فی (نہیں) جانے ہے۔ یہ جد آیا تھا تیں تاپ میں پڑی تھی۔"

"تو ہے کون"

"باجے والا، بیٹیوں کی برات ماں باجہ بجاوتے تھا جس ماں ہاتھی آیا تھا۔"

"پھر تیں اسے کیوں پکارا؟"

"بہت دنوں ماں جو آیا تھا۔"

جب یہ دونوں ماں بیٹی سہ دری میں آ گئیں تو نسا کو پھر بھی قدرت ہی کی دھن لگی رہی۔ باجے والے کا نقشہ اس کے کلیجہ میں چٹکیاں لے رہا تھا وہ اس کا پھر نظارہ کرنا چاہتی تھی اس کی ماں شمال میں بچھی ہوئی چارپائی پر چادر تان کر لیٹ گئی۔ تو اس نے سوچا کہ وہ میرے ملنے کے لئے نہیں تو میرے میتر سے ملنے کے لئے ضرور آئے گا تجھے

یہیں سہ دری میں بیٹھے ہوئے دروازہ کو تکتا رہنا چاہیے جس سے وہ آئیگا لیکن دل کی بے تابی اسے کہاں بیٹھنے دیتی تھی۔ وہ دبے پاؤں پھر جنگلے پر پہنچ گئی۔ قدرت پورب میں مندر کی طرف جا رہا تھا جس کے بھاری بھرکم مخروطی گنبد پر سونے کا جھول پھرے ہوئے پانچ کلس تھے اور بیچ والے ابھرواں کلس پر سونے کا جھول پھرا ہوا چھوٹا سا فی کھونٹا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ وہ اس مندر سے آگے نکل گیا۔ نسا ابھی جنگلے میں ہی بیٹھی تھی کہ ماں نے پھر اندر پہنچ کر اسے ڈانٹنا شروع کر دیا۔

جب لمبے گنبد و مینار کی مسجد میں عشا کی آذان ہوئی تو قدرت صحن کے آخیر میں باہر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ ماں دروازہ کھول کر اسے سہ دری میں لے آئی۔ نسا نے اسے کرسی نما پیڑھے پر بٹھایا وہ اسے اس طرح سے دیکھ رہی تھی جیسے رعایا اپنے بادشاہ کا درشن کرے۔ پھر نسا نے کہا۔ بھائی تو یہاں فی (نہیں) اکل آوے گا۔ مسند پور والے حکیم پہ گیا ہے۔" قدرت کہنا تو یہ چاہ رہا تھا کہ وہ نہیں ہے تو نہ سہی تو تو ہے لیکن اس نے جواب دیا۔" "تیں مجھے نہ جانے ؟" نسا پٹ سے بولی۔ "باجے والا! پیں پیں پیں" قدرت نے اپنے مدہم مدہم چہرے میں سفید سفید دانتوں کی لڑیاں نظارے کے لیے پیش کرتے ہوئے کہا: "اب تو سیانی ہو گئی، باجے پن کی ہلت چھوڑ دے۔" ماں سمجھ گئی کہ یہ وہی دلچسپ لڑکا ہے جسے دیکھنے کیلئے اس کی بیٹی دو مرتبہ جنگلہ پہ گئی تھی اور جس کی پہلی آمد اسے آج تک یاد ہے۔ ماں نے اسے حقہ پانی تک کو نہ پوچھا۔ لیکن اس نے باتوں کا بھڑ

باندھ رکھا تھا کہ مخمول کس طرح سے دو مرتبہ مسندپور میں اس کے پاس ٹھہرا ہے ۔ وہ ایسا اس لئے کر رہا تھا کہ شاید اس سے اس کی کچھ آؤ بھگت ہو جائے لیکن ماں تو ذرا بھی نہ پسیجی ۔ پھر بوندیں اتر آئیں پہلے ہلکی ہلکی پھر زور زور سے رات ایسی اندھیری تھی کہ باہر دیکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا ۔ یورپ کے قرون اسود بھی ایسے سیاہ نہ ہوں گے ۔ ایسا اندھیرا قبل ظہور پیمبر فاران کی چوٹیوں پر بھی نہ ہوگا ۔ سندربن کے چیتے تک ایسی رات میں اندھے ہو گئے ہوں گے ۔

ماں چاہ رہی تھی کہ وہ کسی طرح سے اٹھے اور جائے ۔ کافی دیر بعد جب بوندیں تھمیں تو ماں نے شام کے مہمان سے کہا "بھائی باجے والے مینہ ٹھہرا ہوا ہے نکل جا ۔ کہیں پھر نہ برسن لاگے ۔" وہ اب بھی ڈھیٹ بنا رہا ۔ لیکن جب ماں نے وہ فقرا دوبارہ دوہرایا تو اس نے جانے کی ٹھان لی ۔ جاتے جاتے وہ نسا کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے گویا کہتا جا رہا تھا ۔ "اس طرح آنکھوں پہ ٹھیکری نی رکھا کرتے ۔ تیں مجھے کھواری (خواری) دینے واسطے ہی تھی ۔ جھوٹے منہ سے کہہ دیا ہوتا ، ابھی ٹھہر جاؤ ۔ ایسی برکھا ماں جاکے کیا کرو گے ؛ بس دیکھ لیا تیرا اگاں (لگاؤ) ہمیں تو تیری دا ہیں ہیں والی انوٹ کھینچ لائی تھی ۔" اور نسا گویا جواب دے رہی تھی "کیا بک بک لگا رہا ہے تیں بی (بھی) تھوڑا سا نئیں ۔ بھلا اُدن (اس دن) تیں میرے ہونٹ اتنی لاتنی (سکھتی) سے کیوں چوسے تھے ۔ ہم نے بھی تجھے دیکھ لیا ۔ پھر ایسی اندھیری گھپ رات میں جب گھر پا کوئی مرد نئیں ہم تیرے جیسے مسٹنڈے لوں کیوں ٹھہراتے ۔ جو ایک دپھہ (دفعہ) اینتبار لا اعتبار)

کھو میٹھا.......... کھو میٹھا۔"

قدرت دروازہ کھول کر نکلا ہی تھا کہ نسا کی ماں نے فوراً اس طرح سے کنڈی لگائی تھی کہ جیسے اسے ڈر ہو کہ وہ پھر نہ اندر آجائے۔ چھم چھم چھما چھم مینہ پڑنے لگا۔ وہ چاہتا تو راانگھڑوں کی چوپال میں ٹھہر جاتا۔ جو گاؤں کے نکال پر تھی لیکن اس کا تو کلیجہ ٹکڑے ہوا جارہا تھا۔ اس کی طبیعت اس گاؤں میں ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہرنے کو نہیں چاہتی تھی اس لئے اسے بھیگتے ہوئے ہی مسند پور کی راہ ناپنی پڑی۔ اسی رات جب بجلی چمکتی۔ مینہ پڑتا ببڑ ھے میں کھڑی ہوئی بیری سے تیز ہوا میں شاں شاں کی آواز نکلتی اور اس کے ٹہنے گویا تنے سے جدا ہو کر اڑتے ہوئے سے معلوم ہوتے تو نسا محسوس کرتی کہ صرف قدرت ہی نہیں بھیگ رہا تھا وہ بھی ساتھ بھیگ رہی ہے وہ صبح تک یہ معمّا حل کرنیکی کوشش کرتی رہی کہ آخر وہ کنمن والے میں آیا کیوں تھا؟ کیا اس سے ملنے کے لئے؟ اس سے ملنے کو کیا ضرورت تھی؟

۴

جب مخمول مسند پور سے واپس آیا تو نسا نے قدرت کی درگتی کی داستان اچھلتے ہوئے دل سے ایسے شکایتی سے انداز میں پیش کی کہ وہ خود شرمندہ سا ہونے لگا اور اس نے یہ دھبہ دھونے کی تیاری کرلی۔

اگلے دن وہ اپنے دوست کو لینے کے لئے چلا گیا۔ اور نساء کو رہ رہ کر اس خوشی کا ایسا انتظار لگ گیا جیسے مسلمان کو عید میں ہوتی ہے اور عیسائی کو بڑے دن میں۔ مہمان کے لئے لبرے کا طباق بنتا تھا۔ اس کے لئے منگت عطار کی دکان سے چاندی کے ورق اور کشمکش بادام خود نساء لے کر آئی تھی۔ اس کے دل میں آرہا تھا کہ مخمول کے ساتھ وہ بھی قدرت کو لینے کے لئے مندپور چلی جاتی، کیونکہ اسی طرح سے اسے ستم کش انتظار تو نہ ہونا پڑتا اسے ایک کھٹکا بھی تھا؟ وہ یہاں سے ہنکار کر نکالا گیا کیا خبر وہ ٹمینٹ دکھانے لگے " نہ آئے " وہ اس سے معافی چاہنے کے لئے جان بھی تر لگا دینے کو تھی اس نے یہ بھی پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ جو وہ پریا آگیا تو ماں بھائی کے سامنے تو نہیں لیکن موقع پایا تو اولے پیچھے وہ اسے چار پیار سے پاٹ بھی دے گی۔ جب عشا کی نمازیں ہو چکیں تو منگت عطار کے لڑکے نے آکر خبر دی کہ مخمول مندپور سے کل آئے گا۔ اس خبر سے اس کی خوشیاں اس طرح سے مبدل بہ غمی ہو گئیں جیسے بجلی کا سوچ دبا دیں تو یک لخت اندھیرا ہو جاتے۔

قدرت اور مخمول اگلے دن کندن والے پہنچے مہمان کے لئے ابر حلوائی کی دکان سے تازہ تازہ گھیور منگایا گیا۔ قدرت کی چارپائی مخمول کے ساتھ آنگن میں بچھی۔ ماں بیٹی سو رہی ہیں سو رہی تھیں اصل میں ماں سو رہی تھی نساء جاگ رہی تھی۔ وہ اس لئے جاگ رہی تھی کہ قدرت بھی جاگ رہا تھا کیونکہ جب رات کی گھڑیوں بیچ ٹوٹی تو وہ نساء کی پٹی کے نیچے

کہہ رہا تھا، "لالی لالی! مجھے پکڑوا دے، کھوب جور جور سے چلچلیاں مار کے کہہ دوڑ لو، دوڑ لو۔ تو قدرت گیا چاہے ہے، جو تیں کچھ نہ بولی تو میں سمجھوں گا تیں میری میت بن گئی۔" نسا کچھ نہ بولی بلکہ اس نے تو دوسری طرف کروٹ بدل کے جتا دیا کہ وہ جاگ ہی نہیں رہی بلکہ اس نے تو قدرت کی باتیں بھی سنی نہیں ہیں۔ اب وہ شیر ہی تو ہو گیا۔ جس طرف نسا نے کروٹ لی تھی۔ اس طرف ماں کا پلنگ تھا اور دونوں پلنگوں میں اتنی کم جھید تھی کہ وہ وہاں نہیں آ سکتا تھا۔ اب اس نے سرہانے کھڑے ہو کر اپنے ہونٹ نسا کے ہونٹوں کے ساتھ اسی کئی سال والی سختی کے ساتھ حق دار کی طرح ملا دیئے۔ نسا نے اسے پرے ہٹانے کی حاجت نہ سمجھی۔ وہ تو ایسی بن گئی تھی جیسے کوئی ماہر ساز لیے ہو اور ساز چاہے...... کہ اسے بجائے۔ بجاتا ہی رہے اور انگلی تار پہ پہنچنے سے پہلے ہی تار خود بخود اسی کی طرف اٹھنے لگے۔ نسا چاہ رہی تھی قدرت اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے کبھی نہ اٹھائے بلکہ وہ اس کے اوپر آن بیٹھے، وہ اگر بھاری بجر بھی ہو گا تو اسے خوشی سے برداشت کر کے پارہ پی ہوئی سی پڑی رہے گی۔ پہلے قدرت ہی اسے چاؤ پیار سے پاٹ دے وہ بعد میں پاٹتی رہے گی۔ پہلی اس کی ہی سہی اس وقت قدرت اپنی زبان سے نسا کے ہونٹوں کی ٹٹول سی کر رہا تھا۔ اور نسا بھیگنی سی بن گئی تھی۔

کچھ دیر بعد یہ دونوں ڈنڈے دار سیڑھیوں سے کوٹھے پر چڑھ رہے تھے۔ قدرت آگے آگے تھا۔ جب وہ لب بام تک پہنچ گیا تو اس

سنے دیکھا کہ نسائی تو حسینوں کی مشہور جبلّی اور ترسانے والی عادت کا اعادہ کرتے ہوئے ابھی نیچے ہی کھڑی ہے اس نے جلدی جلدی نیچے اتر کر کہا "جو نیت نہ ہو تو نہ آ" ۔ نسائی نے اپنا سر اٹھا انکار سے ہلا دیا۔ قدرت نے دھمکی دی "مان جا! نہیں تو مسک بنائے کے بھی تو ہٹائے جاؤں گا۔" اوپر جا کر نسائی نے پوچھا "ارے باجے تو ڈوم دھاڑی بجایا کریں ہیں تیں یو پیشہ کیوں لیا ؟"

"میں اپنے گاں (گاؤں) ماں سروع (شروع) سے بین بجایا کرتا تھا۔

"کیسی بین بجایا کرے تھا ؟"

"ایسی بجاؤں تھا، ایسی بجاؤں تھا کہ، میری بین سن کے دیوالی کے دیئے چاٹے کے بلوں ماں سوئے سانپ سنپولئے باہر نکل آویں تھے"۔

"جھوٹے جھوٹے، ہاں جو لیوں کہتا میری بین سن کے گاؤں گوٹے کی چھوکریاں دہی بلونا، اٹیرن، چرخے ہور اوکھلی موسل چھوڑ کے ننگے پاں دلیوں سے باہر نکل آویں تھیں تو کوئی بات بھی بنتی"۔

"اچھا ہور سن میں کسان کا بیٹا ہوں۔ ہمارے دونوں کنوؤں پہ دو دو مال والی ڈولچیوں کے ہرٹے ہیں۔ دھرتی گھر کی ہے۔ میتری ماں سے لڑ کے مسند پور آگیا تھا۔ نوکری، ڈھوتا تو سر کے بال تک اڑ جاتے اب باجا بجاتا پھروں ہوں۔ تیں تو ہماری آج جیا چھت

دضیافت) کی تو گھی بورا کھلا دیا - ہم جس برات ماں جاں ہیں تحفہ کھانا ملے ہے ساتھ تیرے جیسی چھوکریوں کا دیدار بھی ہو ہے -"

"ارے بکھد بد ماس تیں چھوکریوں کی دیدار باجی کی کھاطر (خاطر) ہی باجے والہ بنا ہوگا کیھوں رے پنچال ؟"

"باجے والا نہ بنتا تو تیرے جیسی ناس پیٹی کس طروں ملتی ؟"

جنہیں ملنا ہو وہ سات سمندر پار آ کر ملتے ہیں برسات کی جھڑیوں میں آدھی رات بھوت جیسے دیسی آموں کے تلے ملتے ہیں

اس وقت بادل پھٹا ہوا تھا آسمان میں غلیچیں سی نہاہری تھی ان میں تارے ٹمٹا رہے تھے - ایسی ہوا چل رہی تھی جیسے ساحلی ریگستانوں میں وقت سحر چلے - اور مستعد سنتریوں تک کو سُلا کر رکھ دے - خبر نہیں نسا کو .... کیا ہو گیا تھا - اس کی آنکھیں قدرت سے کاریوں کے مزے لے لے کر کچھ تھوڑی دیر کو پھر اسی گئی تھیں اس نے قدرت کی لمبی گردن میں ٹھوڑی کے نیچے کاٹ لیا تھا - قدرت کہہ رہا تھا "میں نہیں جانوں تھا تیں اتنی نیوری ہو جاگی - اور نسا گویا جواب دے رہی تھی - "میں تو سوچا تھا تجھے اولے باچھے چاؤ پیار سے پاڑوں گی - تیں نے تو میرے ہوس (ہوش) ہی گدلا دیئے"- جب نسا کوٹھے سے اتری تو وہ وہ نہ تھی جا اوپر گئی تھی اور جب اگلی صبح پر یا جانے لگا تو اس کی آنکھوں میں دو بڑے بڑے آنسو ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ دھندلی دھندلی نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی -

ادھر قدرت گھر سے نکلا ادھر لسائ کے دل میں درد جدائی کی ٹیسیں شروع ہو گئیں، ماں کے درد سر کا علاج تو منگت عطار کے پاس تھا۔ لیکن لسا کے درد فرقت کی دوا صرف اس کے پاس تھی۔ جس نے یہ درد دیا تھا۔ سوائے مخمول کے قدرت کو کوئی بلا ہی نہ سکتا تھا اور وہ اسے بلانے کے لئے کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ دن گزرتے جا رہے تھے اور ہر دن اس کے لئے شدید عذاب لے کر آ رہا تھا اور وہ خیالوں میں ساری رات ہی قدرت کے ساتھ غوطہ غوطہ ہوتی رہی تھی۔ اور جب ساڑھی پر درانتی پڑی۔ سوائے بنیوں کے گھروں کے گاؤں کا گل زن و بچہ کھیتوں میں نکل پڑا اور گودڑے کے گیہوں، پنے کٹنے لگے تو لسا ہر سال کی طرح سے سلا چننے نہ نکلی۔ وہ سلا چننے صرف خوش لطفی کے طور پر جاتی تھی۔ اس سال ان کے یہاں فصل کا بڑا زور تھا۔ رات کے وقت لسا کی ماں مخمول سے کہہ رہی تھی "تیں گاں دھورے کٹوا رہا ہے۔ سرمک کے پار ترائی کے جنگل دھورے اجاڑا ہو رہا ہے۔"

مخمول جواب دے رہا تھا "میں سمجھوں تھا گاں دھورے والے کھیتوں میں جا سی اجاڑا ہو گا پہلے انوں کٹوا لوں۔ ترائی کے جنگل دھورے پھر چلے جاویں گے۔"

ماں پھر کہہ رہی تھی فصل جو رہوا کرے تھی تیرا باپ دونوں جگہ ایک ساتھ کٹائی لگایا کرے تھا۔ اس کے پاس گھوڑی تھی دم بھر سے ماں یہاں ہوتا تو دم بھر ماں وہاں۔ تیں بے مار (بیمار) بھی ہے ہو رہا سواری کرنا جانے۔"

یہ گفتگو سنتے ہی نسا کے منہ سے دل کے یہ بول نکلتے نکلتے رہ گئے "بھائی تیں آپ گاں دھورے کٹوآتارہ ہور ترائی کے جنگل دھورے والے کھیتوں کی رکھوالی کے واسطے مسند پور سے میرے پریا نو بلوالے ۔ اسے توتیں جلد ہی بلوالیا ہوتا جد گیہوں کے سرے بھرے کھیتوں کی بالاں سوکھا لانے والی ہوائیں سر جوڑ جوڑ کے ہلا کریں تھی۔ ہور سرسوں کی سوکھی ٹٹار پھلیوں سے درد کے باجے بجا کریں تھے۔ تیں نی جانتا سڑک پار ترائی کے جنگل دھورے والے کھیتوں ماں اسی بکھت (وقت) سے اجاڑا ہورہا ہوگا۔" لیکن یہ بظاہر ان چھیڑ لڑکی اپنے بھائی کو ایسی صلاح کیسے دے سکتی تھی؟"

پھر ان بولوں کا مطلب نسا کی ماں اپنے منہ پہ لے آئی "بھلا جو تیں قدرت نوں بلالے۔" مخول نے جواب دیا "باجے والا کھیتی کے دھندوں نوں کیا جانے"۔ اب بھی نسا کے منہ پہ یہ بول آتے آتے رہ گئے کہ "بھائی تیں قدرت کو محض باجے والا ہی نہ سمجھ، وہ تو کسان کا بیٹا ہے ان کے دونوں کنوؤں پہ ٹین کی ڈولچیوں والی ڈھیل مالیں پڑی ہوئی ہیں۔"

اب نسا کو یہ افسوس ہونے لگا کہ بھلا قدرت بھائی کو اپنی داستان سنا دیتا تو کیسی اچھی بات تھی جو وہ اب آجائے تو میں اسے کہوں "رے قدرت جو بھائی جان گیا تیں کھیتی کے دھندے بی (بھی) جانے ہے تو گاج مارے تیری کیمت (قیمت) بڑھ جائے گی تجھے کندن تائے

ہیں ٹھہرنے کے بہانے مل جاویں گے۔

۴

قدرت کا دل بھی نسائی کے بیٹے اکھڑا اکھڑا ٹوٹا ٹوٹا رہتا تھا۔ نسائی نے اس کی لمبی گردن میں ٹھوڑی کے نیچے جو کاٹ لیا تھا تو قدرت کی مرضی تھی کہ وہ نیل جو نسائی کے دانت سے ڈالے تھے جنم بھر اچھے نہ ہوں۔ ہائے وہ اس رات کیسی نیوری سی ہو رہی تھی۔ وہ ہر وقت سوچتا رہتا۔ دیہاتی بینڈ ماسٹر کے گھر ڈیوڑھی کی جس بغلی کوٹھری میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے سامنے جمیعت قاسم پور بینڈ کی چوپال تھی۔ وہ چوپال میں گھبو یعنی لمبی چھتری پہ کبوتروں کو اڑتے بیٹھتے دیکھتا رہتا۔ کبھی اس کی آشفتہ طبیعی نفیری پہ رقت کے جاں گداز راگ گوا تی اور کبھی وہ نہر کنارے کلنٹے سے مچھلیاں پکڑنے بیٹھے جاتا۔ جو کوئی مچھلی پھنس جاتی تو وہ اُسے پھر سے نہر میں پھینک دیتا

ایک رات مخموکل اور اس کی ماں دور افتادہ کھیتوں کے اجاڑے پر سوچ بچار کر رہے تھے۔ چوڑے چہرے والا خوش خوش چاند لمبے نرٹ گے سمیل سے اس طرح تک رہا تھا۔ جیسے اسے بھی اس گفتگو میں دلچسپی ہو۔ جیسے اسے بھی یہ تمنا تھی کہ ان دونوں کے فکر میں شریک ہو جائے تمباکو کے کھیت میں رکھوالے کی پیڑی پہ مسخی نائی کی خوش الحان اور چہچہی

لڑکی اپنی ہمجولیوں کے ساتھ ٹمک بجا بجا کر گا رہی تھی ؎

جنہائی ماں آیو رے مورے میت
پڑیا بن کے آنا ہاں
رسیا بن کے آنا ہاں
سہجادہ بن کے آنا ہاں
دِنا دِن، دِنا دِن، دِنا دِن، دِنا دن
جنہائی ماں آیو رے مورے میت
کٹیّا بن کے نہ آنا
کبڑھی بن کے نہ آنا
کٹھور بن کے نہ آنا
پریا بن کے آنا ہاں
رسیا بن کے آنا ہاں
سہجادہ بن کے آنا ہاں
دِنا دِن، دِنا دِن، دِنا دِن، دنا دِن
جنہائی ماں آیو رے مورے میت

تو اسی چاند کی سمت سے قدرت بھی آ گیا اس نے لنساء کی طرف تو توجہ ہی نہ کی اور بھائی ماں کو سلام کر کے بولا "تمہارے ترائی کے جنگل وھورے والے کھیت اجڑے جا رہے ہیں۔ کچھ بندوبست کرو، ہمارے دو جگہ کٹائی لگا رکھی تھی۔ ایک جگہ میں

ہوا کروں تھا - دوسری جگہ میرا میاں (یعنی باپ) -

یہ سنتے ہی نسا بڑھی خوش ہوئی اور خوش تو اس کی ماں اور میرا بھائی بھی ہوا - اگلے دن دور آفتادہ کھیت قدرت کی نگرانی میں کٹ سبھی تھے اور ان لڑکیوں میں جنہیں وہاں سلا چننا نصیب ہوا تہوار سے چہرے والی نسا بھی تھی، سخی نائی کی چرپراق لڑکی نے آج کہا "جو بو مسند پور کا گلچہ (غلچہ) نہ آتا تو نمبردار کی ساڑھی ہی نہ کٹتی" دوسری نے پوچھا "کیوں ری کیوں سکھی نائی کی پھر کیا ہوتا!۔

سخی نائی کی بولی "سارے گیہوں، چنے بالوں بوٹوں ہی سے چنک چنک کے جھڑ پڑتے ہور ساؤن ماں دانہ دانہ جھڑ جاتا نسا" "سکھی نائی کی! تمہارے کھیت سے نکل جا - تیں پا ہوئے نوں گلچہ کیوں کہا؟ دکھے (یعنی دیکھ) تیرے باپ کی کسیت کھوسوا دوں گی -"

سخی نائی کی - "نمبردار جی کی چھوکری! میں تیرے آگے ہاتھ جوڑوں میرے منہ سے گلچہ نکل گیا - مافی (معاف) کردو جو تمہاری ساوی ہوئی تو اس میں بیا بلا بھی تو میں ہی گاؤں گی"۔

اس ہلکے سے جھگڑے کی شہرت سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ کہ ان دونوں میں کچھ اندر خانہ ہے - حالانکہ نسا نے قدرت کو سوائے یونہی خفی خفی سی چتونوں کے اس دفعہ اچھی طرح سے دیکھا تک نہ تھا - گر اصل میں وہ اس کے دم قدم کے ساتھ لگی پھرتی تھی - اس کا منہ

اس لئے چڑھ رہا تھا کہ جب قدرت چڑھے چاند کی روشنی میں آیا تو اس نے بھائی اور ماں کو تو سلام دعا کی لیکن اس کا حال احوال ذرا بھی نہ پوچھا۔ نساء کو یہ خبر تھی کہ رواج کے موافق غیر مرد جی دھانیوں سے زیادہ بات نہیں کیا کرتے اور نہ ہی سلام دعا۔ وہ قدرت کو ایک میٹھا سا چپکہ دے کر دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کا کیا حال ہوتا ہے لیکن خود چپ کے کھا رہی تھی۔ قدرت جب اس کے پاس سے گزرتا یا وہ کسی سے بات کرتی تو وہ ذرا بھی تو مائل نہ ہوتا۔

جب ساڑھی کٹ چکی اور اناج بھی اٹھ چکا تو قدرت کی کندن والا سے جانے کی باری آگئی۔ اس ڈیڑھ ماہ کے عرصہ میں چکوا چکوی آپس میں ایک بات بھی نہ کر سکے۔ جس رات کی صبح کو قدرت رخصت ہونے والا تھا۔ چاندنی ایسی کھل رہی تھی کہ سوئی میں دھاگہ پرو سکتے تھے۔ نساء کی چارپائی تو سہ دری کے آگے اس کی ماں کے پاس تھی،.... .... اور قدرت بھائی کے پاس بیری کے نزدیک سو رہا تھا۔ ان دونوں کی یہ رات بھی اکارت ہی گئی۔

۵

اگلے دن جب تھوڑا سا سورج چڑھے اس کا پرپا جانے لگا تو نساء یوں محسوس کرنے لگی جیسے سارا کندن والہ ہی اس کے ساتھ جا

رہا ہے۔ آسمان زمین اس کے ساتھ جا رہے ہیں۔ اور وہ اکیلی نہیں جا رہی ہے۔ ماں نے مہمان کے لئے گاوے گھی کے پراٹھے پکائے تھے۔ اور اکو حلوائی کی دکان سے کھویا منگوا کر کھانچی کی کھانڈ کا دودھ سے صاف کر کے بنایا ہوا دانہ دار بورا اس میں ملایا تھا کہ وہ اس سے پراٹھے کھا سکے جب وہ چلنے لگا۔ تو ماں دعائیں دیتی ہوئی دروازہ تک اس کے ساتھ آئی اور بھائی اسے گاؤں کے نکال بردا گھوڑوں کی چوپال تک چھوڑنے گیا۔ نساؔ اسے جاتے ہوئے کو دیکھ کر جنگلے والے کوٹھے میں جا بیٹھی۔ اس نے قدرت کو جنگلے میں سے جاتا ہوا دیکھ کر اپنا سینہ پیٹ لیا۔

کندن والے سے مسند پور کا راستہ کم الائچیوں کے کنجوں کے پاس سے جاتا تھا۔ یہ درخت یوکلپٹس ایسے تھے۔ جن کے پتوں سے الائچی ایسی خوشبو آتی تھی۔ یہ پیڑ بجائے اونچا جانے کے چھتری کی طرح سے چار طرف پھیل کر کنج بناتے تھے ان کے مغرب میں ایکڑ بھر کا ٹکڑا تھا جہاں نساؔ کے ہم شکل اور ہم رنگ شمشاد کھڑے تھے اور پھر شیام نہر بہہ رہی تھی۔ نہر کا شرقاً غرباً پل لال پتھر کا تھا جس سے پانی میں اترنے کے لئے ہر ایک در سے زینے اترتے تھے۔ تار کول بھرے ہوئے ڈرموں کے اٹھانے کے لئے اوپر دستی مشینیں رکھی تھیں ایک اور آہنی پل اس برساتی ندی پر تھا۔ جو نہر کو کاٹتی ہوئی غرب میں جاتی تھی شیام نہر کا پانی خشک برساتی ندی کے اونچے اونچے کناروں میں شمال کی جانب نو دو فرلانگ تک چڑھا ہوا تھا۔ مسند پور جانے

کے لئے کنجوں تک اس طرح سے پہنچتے تھے کہ یا تو دو فرلانگ اوپر جاکر جہاں شیام نہر کا چڑھا ہوا پانی ختم ہو جاتا تھا۔ وہاں سے سر کھے سوکھے آتے یا چکر سے بچنے کو کنجوں کے سامنے والے کھلے کنارے سے ہی تا گہری تا گڑی پانی میں کو گزر کر آ جاتے۔

لنسا آج برساتی ندی کے خشک راستہ سے آکر کنجوں میں چھپ گئی تاکہ اسے جاتے کو دیکھے جو اس کے بھائی کا بڑا فائدہ کر کے جا رہا تھا۔ لیکن اسے اجاڑ کر۔ وہ صرف قدرت کے سامنے آکر کھڑی ہو جانا چاہتی تھی۔ اس کا خیال اس سے بات کرنے کا نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے یوں سامنے آنے ہی سے سب عقدے حل ہو جاتے تھے۔ وہ اس بات سے بہت ہی بیاکل اور شرمندہ تھی کہ اس نے اتنے عرصہ تک کیوں اس سے کلام نہیں کیا تھا۔

لنسا گھر سے کسی کو کچھ کہہ کر نہ نکلی تھی۔ ماں نے اسے جنگلے سے قدرت کو دوبارہ پکارتے ہوئے دیکھ کر جھاڑا تھا۔ قدرت کی طرف واری میں وہ سمجھی نائی سے جھگڑا کر چکی تھی اور پھر ان دونوں کا ایک دوسرے سے بلاوجہ کھنچے کھنچے رہنا بھی قدو معنی معلوم ہوتا تھا اب وہ بلا اطلاع غیر حاضر تھی۔ اس لئے ماں کو یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو وہ قدرت کے ساتھ نکل گئی ورنہ اور کہاں جاتی۔

لنسا کی ماں خانہ بدوشوں میں کی تھی جنہیں یورپ میں جپسی کہتے ہیں۔ وہ کافی عرصہ سے مدنی زندگی گزار رہی تھی لیکن آج اس میں

پھر پرانا خانہ بدوشوں کا جھمیلا پن آگیا۔ وہ راگھڑوں کی چوپال میں محمول کے پاس جاکر اس طرح سے غوغا کرنے لگی جیسے ایاگو نے اس وقت کیا تھا۔ جب ڈیسڈیمونیا او تھیلو کے ساتھ چلی گئی تھی۔ پھر زہرہ بادی محمول اور اس کی ماں شام نہر کی طرف دوڑے۔

ادھر لنسا جنگل میں چھپی ہوئی دور سے دیکھ رہی تھی کہ قدرت نے برساتی ندی کے سنسان پکے اور ڈھلوان کنارے پہ دھوتی آتار دی ہے اور وہ پانی میں داخل ہو رہا ہے۔

اس وقت وہ بے تحاشہ بے باکانہ اور بے تابانہ بھاگ کر قدرت سے مل جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے اس وقت وہی پریا یاد آ رہا تھا جس کی لمبی گردن کی ٹھوڑی کے نیچے اس نے کوٹھے پہ نیوری ہو کر کاٹا تھا۔ اور اس کی آنکھیں کچھ دیر کو پتھرا سی گئیں تھیں۔ جب وقت قدرت کے پانی تا گھٹنے تک پہنچا تو اس نے قمیص کو بھیگنے سے بچانے کے لئے کافی اوپر اٹھا لیا۔ اس وقت لنسا کی تلوا اور بھوگ اگنی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ قدرت سے ملاپ کی خاطر پانی میں آجاتی تو پانی جلنے لگتا۔

قدرت اس پار آکر برساتی ندی کے پختہ اور ڈھلوان کنارے سے اوپر چڑھ گیا۔ یہاں وہ لال پتھر کی چھتری سی تھی۔ جس پر بعض دفعہ کئی کئی آدمی نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ اور یہ پتھر کھرے کلہاڑیاں چلانے کے کام بھی آتا تھا۔ قدرت نے اپنی پوٹلی پتھر پہ رکھ دی اور وہ کنجول

کی طرف سے منہ پھیرتے ہوئے ٹانگیں ٹکائے ہوئے بیٹھ گیا۔ نساء اس کی طرف بیں بیں کرتی چلی آ رہی تھی۔ قدرت اس کی جانب بڑھا تو وہ محبوبوں کی دیرینہ چکمت بازی دکھاتے ہوئے پچھلے پیروں کنجوں میں بھاگ گئی

جس وقت یہ دونوں کنجوں میں داخل ہوئے تو مخمول مع ماں کے پرلے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اور انہوں نے یہ جوڑا بخوبی دیکھ لیا تھا۔ جب ماں بیٹے کنجوں پہ آئے تو قدرت نساء کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ اڑن گھائیاں دیتی ہوئی اس کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ قدرت اپنے دوست کو دیکھتے ہی درختوں میں بھاگ گیا اور وہاں سے اپنے گھر۔ نساء کو مخمول اور اس کی ماں اس طرح سے گاؤں میں پکڑ لائے جیسے خانہ بدوشوں نے شکار مارا ہو۔ اب نساء زبر بادی سے تو شادی کرتی نہ تھی اور دوسرا کوئی بھی اچھا گھرانا اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس لئے وہ کنواری ہی بیٹھی رہی۔

پھر ایک سال جب جاڑا پیر پیٹ رہا تھا، شفتالو، ناشپاتی کے پیڑوں پہ تو پتہ نہ تھا لیکن شاخیں پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شام نہر کے کنارے سمبل پھول رہا تھا۔ اور سارڈھی پکانے والے خشک تیز ہوا جھکورے مارتی گرد اڑاتی دن دن بھر چل رہی تھی لمندان والہ کے سابق نمبردار کی بیٹی کو قدرت بے حد یاد آ رہا تھا۔ سخی نائی کی چچیری لڑکی کی بارات آئی ہوئی تھی جس میں مسند پور کا وہی انگریزی باجہ تھا۔ مخمول نے اپنی ماں کو یہ خبر آ کر سنائی "قدرت کا ماسٹر کیے

تھا۔ اس نے شادی کرلی، اس کے دو بچے ہیں۔" یہ سن کر نسائی نے کنواری رہنے کا اور بھی تہیہ کرلیا۔ اس کے منہ میں ہر وقت یہ بول رہتے تھے۔

جنہائی ماں آیو رے مورے میت
بانکے رے بانکے مجھے تیری حپاہنا

فتنۂ بغداد

ماں باپ نے صرف جدت طرازی کی خاطر اس کا نام قبیحہ رکھ دیا تھا۔ ورنہ وہ حسن بے مثال تھی۔ اور ابتدائے شباب ہی سے دارالخلافۂ عباسیہ کے خاص و عام اسے فتنۂ بغداد پکارنے لگے تھے۔

کبھی اس نے ولیعہد سلطنت امین کی طرف ابو نصر جوہری کی دکان پر چور نگاہوں سے دیکھ لیا تھا۔ تو وہی نگاہیں ولی عہد کے دل میں کھب گئی تھیں۔ شہزادے کے اوسان جاتے رہے تھے۔

ملکہ زبیدہ خاتون اپنے لاڈلے بیٹے کی فرمائش پر قبیحہ کو ضرور پیغام بھیجتی، مگر ہارون الرشید مخالف ہو گیا پرچہ نویسوں نے خبر دی تھی کہ وہ نبید پیئے چاندنی راتوں میں کسی لبنانی امیر زادے کے ساتھ دجلہ کے غیر آباد اور سنسان مقاموں پر کشتی کی سیر کیا کرتی ہے۔

یہ رشتہ صرف اس بنا پر رک گیا، ورنہ اور اسے کون روک سکتا تھا۔ ؟

پھر اس کی شادی یک لخت ملک عکاس سے طے ہو گئی۔ مگر ابھی رخصتی نہ ہونے پائی تھی کہ ملک عکاس کو ہسارہ دیلم میں جلاوطن کر دیا گیا۔

اس نے ہارون الرشید کے باغی وزیر کو پناہ دی تھی ۔ کوئی اور ہوتا تو دار پہ چڑھا دیا جاتا ۔

اس واقعے کے بعد ملک عکاس کے اقربا بغداد سے پچاس کوس دور جانب شمال اٹھ گئے ۔ یہاں دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے ان کا محل تھا۔ جس کے چوگرد قسم قسم کی کھجوروں کے تختے تھے ۔ ان باغات کو اتنی اونچی فصیل احاطہ کئے ہوئے تھی کہ اسپ سوار اپنے نیزے کو چاہے جتنا اونچا اٹھا کر پاس سے گذرتا اندر والوں کو اس کا سر النظر نہ آسکتا تھا ۔ فصیل کے ملحق جانب شرق بصرہ سے موصل جانے والی شاہراہ تھی جس پہ سر رات کارواں آتے جاتے رہتے ۔

اس خود عائد کردہ دیس نکالے کا مقصد دراصل بلا واسطہ طور پہ ہارون الرشید پر اثر ڈالنا تھا کہ وہ ملک عکاس کو معاف کر کے واپس بلا لے ۔

انہیں پہنچے ہوئے دو تین دن ہوئے تھے کہ ایک رات جب بالاخانہ پہ بالکنی کی بغلی محرابوں میں قوس قزحی پردوں کو نرم نرم باد بیاباں لہرا رہی تھی ، اور انار نما قندیلیں صندلی چھت سے طلائی زنجیروں میں لٹکی ہل رہی تھیں ، چاند نکلا ہوا تھا ، کھجوروں کے باغات میں طلسمی سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی تو جرس کارواں کے ساتھ ساتھ ایسی آواز آئی ، جیسے کوئی آہ و بکا کر رہا ہو ۔ مگر کارواں گزر جانے کے بعد وہاں کچھ بھی نہ تھا ۔

ایسا بار بار ہوتا رہا تو قبیحہ کے چچا نے اس کی چھان بین کرائی ۔ مگر کچھ کھوج نہ لگا ۔

انہیں دنوں قبیحہ پر پہلا دورہ پڑا۔ وہ اسی بیماری میں مبتلا چلی آ رہی تھی۔ اسے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد دورے پڑتے تھے اور وہ بہت نحیف ہو گئی تھی۔

کبھی اس کا چہرہ جزیرہ صقلیہ کے سیبوں ایسا چہچہاتا ہوا تازہ تبازہ تھا۔ مگر اب وہ فلسطین کا گریپ فروٹ بن کر رہ گئی تھی۔

کوئی کہتا کہ وہ آسیب زدہ ہے اور کوئی کچھ۔ اس کے علاج پر لاکھوں دینار خرچ ہو گئے۔ دمشق، بیروت، قیروان، قرطبہ و اشبیلیہ تک کے طبیبوں نے آ کر اس کا علاج کیا۔ ہندوستان کے سیانے اور بابل کے کاہن تک بلائے گئے۔ مگر اس کی حالت بدستور چلی گئی۔ وہی زور زور سے رونا، چیخیں مارنا، کپڑے پھاڑنا، نہ کھانا نہ پینا، اور محل سے اٹھ اٹھ کر فصیل باغات کی طرف اس وجہ سے دوڑنا کہ پھاٹک سے نکل کر ریگستانوں میں چلی جائے اور حبشی پہرے دار دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔

کم قیام موسم سرما کے بعد دیر قیام موسم گرما آیا۔ اور اسے شدید قسم کا دورہ پڑا۔ اس نے تمام پہلے دورے مات کر دیئے۔ جب دو ہفتے کے قریب گذر گئے اور راتوں کی نیند اڑ گئی تو اس کی ماں کو بڑا فکر ہوا قبیحہ اس کی اکلوتی اولاد تھی مگر اس کے باپ کے مرنے کے بعد اگرچہ اس نے عدت گذرتے ہی اپنے دیور سے عقد ثانی کر لیا تھا۔ لیکن اس بارہ سال میں ان کے کوئی لڑکا یا لڑکی پیدا نہ ہوئی تھی۔ دور دراز ملکوں کے طبیب سیانے ...... اور کاہن تو پہلے ہی آ چکے تھے مگر لاحاصل، اس لئے قبیحہ کی ماں کی

رائے ہوئی: "جب تک بغداد کے حکیم سے رجوع نہیں کیا جائیگا۔ کامیابی نہ ہوگی۔ دوسرے مقامات کے طبیب صرف طبیب ہیں۔ بغداد کے اطبائ کو حکمت بھی آتی ہے۔ بعض امراض میں محض دوائیں کارگر نہیں ہوتیں۔"

"مگر جب تک ملک عکاس لوٹ کر نہ آئے گا، ہم بغداد سے کوئی سروکار نہ رکھینگے۔" قبیحہ کا چچا بولا۔

لیکن ہمیں تو اس کی جان بچانی ہے۔" قبیحہ کی ماں نے جواب دیا۔

ماں کی بات چلی، اور بغداد کے حکیم کو بلاوا بھیج دیا گیا۔

بغداد کے حکیم کو شہزادی کا مرض لاعلاج معلوم ہوا۔

مگر ایک شب محل کے کتب خانے میں بیٹھے ہوئے اس نے واہمے کے طریقے پر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ آہ و بکا کی آواز سنی۔ وہ حبشی پہرداروں سے فصیل باغات کا جنوبی پھاٹک کھلوا کر ریگستان میں نکل گیا۔ خدام اسے رات کے خاصے پر بلانے کو دوڑے۔ مگر وہ جا چکا تھا۔ اسے تلاش کرنے کے لئے قراول تک بھیجے گئے وہ انہیں تک نہ ملا۔

علی الصبح جب اونچے ٹھنٹھ پہ بیٹھی ہوئی چیل بولی۔ ہُد ہُد اڑتے پھرنے لگے۔ فاختائیں کھجوروں پہ بیٹھی مکتب کے بچوں کی طرح ہل ہل کر نغمہ سرائی کرنے لگیں اور بغداد سے آئے ہوئے شکاریوں نے چھوٹی کمانوں کے تکلے نما تیروں سے دجلہ کے کنارے آبی پرند مارنے شروع کئے۔ تو وہ لوٹ آیا۔ وہ رات بھر نہ سویا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں جل نہیں رہی تھیں بلکہ اسکا چہرہ چاندی کی طرح خنک تھا۔

اسے ایسی شتابی پڑی تھی۔ جیسے نامہ بر خلیفہ ثانی کو نہاوند کی فتح عظیم کا مژدہ سنانے جا رہا ہو۔ اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے "یساعو پُساعو (جلدی کرو، جلدی کرو) مرض تشخیص ہو گیا۔ اس کی جان بچ گئی۔ وہ نو بر نو ہو جائے گی۔ مجھے موقعہ دیا جائے۔"

اسے موقعہ دیا گیا۔ اس نے محل کا عجائب گھر کھلوایا۔ کبھی اس کی نگاہ بنو امیہ کے کسی خنجر پر جاتی تھی، کبھی کسریٰ کے نوادر پر۔ وہ کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ مگر جوں ہی اس نے ایک خوش رو نوجوان کی تصویر دیکھی وہ ایسا ہشاش ہوا کہ جیسے کسی اعرابی کو اس کا کھویا ہوا اونٹ مل جائے۔

یہ تصویر الٹ پلٹ سامان میں پڑی ہوئی تھی اسے چھپانے کی غرض سے وہاں ڈالا گیا تھا۔ حکیم نے اس کی گرد دامنِ قبا سے صاف کی۔ وہ اسے لئے کھجوروں تلے پھرنے لگا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ آسمان پر نیزوں کی تیز نوکوں ایسے تارے پھوٹ آئے۔ عشا کے بعد دور دراز کھجوروں کے جھنڈ سے بے نور چپیڑ لگا چاند نکلا اور فصیل کے پہرہ داروں نے آج آہ و بکا کی جگہ قہقہوں کی آواز سنی۔ حکیم ان قہقہوں کو سن کر اس طرح کی حرکتیں کرنے لگا جیسے وہ مؤکلوں کو بلا رہا ہو۔ پھر کبھی وہ دُعا کیلئے ہاتھ اٹھاتا تھا اور کبھی جھولیاں دیتا۔

اگلے دن بعد عصر وہ تصویر کو محل میں لے گیا اور اسے بالاخانے پر قبیحہ کی خوابگاہ میں سجا دیا۔

جب سورج غروب ہو گیا اور چمگادڑیں اڑنے لگیں، تو قبیحہ کو تصویر

کے قریب لایا گیا۔ اس کے پاس ایک پتلی سی مدھم موم بتی جل رہی تھی۔ وہ آتے ہی اس کی طرف مائل ہو گئی، مگر حکیم تصویر پر سیاہ رومال ڈال کر اسے ہلکانے لگا۔

اس وقت اس نے قبیحہ کے آگے پنج گوشہ پیڑھی دار طلائی طشتری میں گھلی ہوئی رس ٹپکتی کھجوریں پیش کیں۔ یہ ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے گاڑھے شیرے میں پڑی ہوئی گلاب جامنیں۔ شہزادی نے انہیں کھا لیا۔ مگر کشمکش اب بھی جاری تھی۔ حکیم اسے ترسا رہا تھا۔ جب تاریکی بڑھ گئی تو رومال ہٹا دیا گیا۔ پھر حکیم نے تصویر وہاں سے علیحدہ کر دی اور خود بھی چلا گیا۔

اسی رات اس کی چیخیں بند ہو گئیں۔ اس نے اپنے کپڑے بھی نہ پھاڑے وہ گہری فکر میں مستغرق تھی۔

حکیم نے اپنا عمل کئی روز جاری رکھا۔ اسے ہوش آنا شروع ہو گیا۔ اور آخر میں تصویر اس کے حوالے کر دی گئی۔

اب اس نے غسل کیا، پوشاک بدلی۔ اس کی آنکھوں میں بابل کے جادو جاگنے لگے اور رخساروں میں صقلیہ کے سیبوں کا رنگ آنا شروع ہو گیا۔ وہ روبصحت تھی اور حکیم اپنے دامن دیناروں سے بھر کر رخصت ہو گیا۔

وہ کئی ماہ اچھی رہی۔ یہاں تک کہ جاڑا گزر کر پھر گرمیاں آ گئیں، اور اب پھر اسے دورے پڑنے لگے۔ یہ دورے پہلے سے کہیں زیادہ سخت تھے۔ حکیم کی تلاش ہوئی، مگر وہ بغداد سے غائب تھا۔

اسے لبنان کے کسی نیم آزاد رئیس نادے کے علاج کے لئے

لے گئے تھے۔ جو دیودار کے جنگلات سے پٹے ہوئے پہاڑوں میں برف کی سفید سفید چوٹیاں ابھری چھوڑ کر پہلے تو خبر نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ مگر اب اس نے بعلبک کے کھنڈرات میں زندگی بسر کرنی شروع کر دی تھی۔

سنا گیا تھا کہ جنات کی داستانیں پڑھ پڑھ کر وہ پری کو فتہ ہو گیا ہے، اور خود اسی موہوم فضا اور ماحول کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا ہے۔ بعلبک کے کھنڈرات میں رہتے ہوئے اسے کئی ماہ ہو گئے تھے۔ حکیم یہیں آیا ہوا تھا عباسی قاصد نے اسے یہیں آلیا۔

جب حکیم قبیحہ کے چچا کے پاس پہنچا تو اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

"تصویروں سے اب یہ عقدہ حل نہ ہو گا میں نے تو وقت گذاری کے لئے تھوڑی سی افیون دی تھی کہ ملک عکاس کے آنے تک اثر باقی رہ جائے، مگر میں کیا کروں، مریضہ عادی بن چکی ہے، اور اب یہ نسخہ بے کار ہے۔"

"پھر کیا کیا جائے؟"۔ قبیحہ کے چچا نے دریافت کیا۔

"مجھے وہ شخص لانا ہو گا جس کی یہ تصویر ہے"

"وہ ہمارا دشمن ہے۔ عدوے مبین"

"کیوں؟"

وہ قبیحہ کا خواہاں تھا، مگر وہ خاندان شاہی سے نہیں بلکہ محض ایک پہاڑی سردار ہے، ہمارے خردسہ کی ایک چھوٹی سی ریاست کا امیر زادہ، ہم اسے

ناپسند کرتے ہیں۔"

"اسے........."

"ایسا ناممکن ہے، قطعی ناممکن۔"

"تو پھر مجھے اجازت ؟ ۔"

"کیسی اجازت ؟"

"یعنی رخصت کی۔"

"تم جا سکتے ہو۔"

قبیحہ کی حالت دن بدن ابتر ہوتی چلی گئی۔ احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے اور وہ تار جو شمع زندگی کے روشن رکھنے کے لئے ناگزیر ہوتا ہے، اتنا باریک پڑ گیا کہ موٹی نگاہ والے اس میں اور موم میں تمیز نہ کر سکیں۔ اب تو شہزادی کی والدہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے حکیم کے پاس پھر قاصد دوڑایا۔ حکیم نے بعلبک کے کھنڈرات کی راہ لی تھی وہ لبنانی رئیس زادے سے سرگوشیاں کرتا نظر آیا۔ جو حکیم کے ساتھ اس طرح پھر رہا تھا کہ جس طرح ارشاد کا کھو کا گھوڑا۔

کھجوریں پک گئیں۔ بغداد سے پچاس کوس باغ لب دجلہ کے علیحدہ علیحدہ ٹکروں میں کہیں لعل بدخشاں سے زیادہ سرخ، کہیں پھلینوں سے زیادہ جامنی، کہیں فلسطین کے سنتروں سے زیادہ نارنجی اور کہیں قبیحہ کی پتلیوں ایسے سیاہ خوشے لہلہاتے درختوں سے ٹپک رہے تھے کہ ہارون الرشید کے پرچہ نویسوں نے خبر پہنچائی کہ شہزادی قبیحہ کا جو کبھی فتنۂ بغداد کہلاتی تھی، برا حال ہے۔ خلیفہ نے برق پاشاہی گھوڑے ملک عکاس کے لانے کو اقلیم دیلم روانہ کر دیئے

مگر اسی دوران میں ایک شب پہاڑی رئیس زادہ قبیحہ کی والدہ کے

الیاس بذریعہ چور دروازہ محل میں داخل ہوا۔ فہیمہ پہلے تو اسے دیکھتے ہی ہک دھک سی رہ گئی تھی۔ مگر بعد میں وہ دونوں لبنان کے برف پروردہ تفریحی میوے کھا رہے تھے۔

"پھر وہ بالاخانے پر عروسی دھجا کی خلوت گاہ میں پہنچ گئے جس کی خوب آئینہ بندی کی گئی تھی۔ یہاں طلائی زنجیروں میں لٹکتے ہوئے انار نما قندیلیں روشن تھے۔ باجرے رنگ کے پیرٹھی دار ظروف میں لوبان سلگ رہا تھا اور طاقوں میں خوش رنگ پرندوں کے مجسمے سجے ہوئے تھے۔"

ابھی پاؤ رات ہی گذری تھی کہ خلوت گاہ میں لطف شباب گھل گیا تھا۔ تار اور مضراب میں رشتے قائم ہو گئے تھے۔ خواصیں نبیذ کی سربند بوتلیں فالسئی طشتریوں میں رکھ کر لے آئیں۔ چھت کا ہفت رنگ حریری پنکھا ہوا کے ساتھ ساتھ عطر بیزیاں کر رہا تھا۔ اور کھڑکی تلے، منزل زیریں میں، علاقہ کوہ قاف کی سرخ و سفید شوخ دتابندہ کنیزیں باری باری سے طنبورہ رباب، جلاجل، قیسارہ اور دف دعود پر حسب و شباب اور شرب و گناہ کے شوق انگیز گیت گا رہی تھی۔

موسیقی کے ساتھ ساتھ وہ نبیذ پینے لگے۔ سب حجاب برطرف ہو گیا، تو لطیفہ طرازیاں شروع ہو گئیں پھر وہ بھی گانے لگے۔

اہویت بتقبل یدھا۔
فقالت قبل تشفتی

ترجمہ: میں نے کہا "کیا مجھے دست بوسی کی اجازت ہے؟"۔
اس نے جواب دیا "کوئی مضائقہ نہیں آپ لب بوسی کر سکتے ہیں۔"

یہ زمانہ جاہلیت کی ایک شاعرہ کا بیت تھا۔

رات کے ہوتے ہی اندھیرا چل پڑا۔ خلوت گاہ کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر دینے پڑے۔ اور مہمان نے میزبان کو بلا اکراہ و اجبار مطیع اور فرمانبردار بنالیا۔ یہ بات ملک ہلاکاس کو حاصل نہ ہوئی تھی اتار نما قندیلیں یہ دیکھ کر بھڑکنے سے لگے تھے۔ پھر وہ جزوا وسالماً پہاڑی رئیس زادہ کے تصرف میں آگئی تھی۔ وہ دونوں لبریز ہو رہے تھے۔ خلوت گاہ میں لطفِ شباب کھل گیا تھا۔ تار اور مضراب میں رشتے قائم ہو گئے تھے۔

شہزادی کی آنکھوں میں پھر بابل کے جادو جاگ گئے اس کا چہرہ خارِ مغیلاں بن گیا۔ وہ امیر زادے کو "یاجلیسی، یاجلیسی" کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ اور کبھی کہہ رہی تھی "اَحسَنتَ! اَحسَنتَ! اَحسَنتَ!"۔

رات کے آخری حصے میں اندھیرا بند ہو گیا۔ اور وہ ہنوز حسب و شباب کی شوقینوں میں گم تھے اور کوہ قاف کی پری نادکنیزیں کواڑوں کی جھولوں سے شرم اور بے باکیاں، حجاب اور عریانیاں، صلح اور لڑائیاں، شکست اور کامیابیاں دیکھ رہی تھیں۔ کسی کے ہونٹوں پہ ہنسی بن رہی تھی تو کسی کے مکھڑاں پہ۔

مگر کریں سبھی کی پلکیں لگا رہی تھیں۔

اتنے میں پھاٹک کی طرف سے شور اٹھتا ہوا آیا۔

اہلاً و سہلاً مرحبا! اہلاً و سہلاً مرحبا، اہلاً و سہلاً مرحبا!"

ملک ہلاکاس کوئی ساعت میں آیا چاہتا تھا۔ اور کچھ ہی ساعت میں۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔ جب چودھویں کی چاندنی سفید فصیل، باغات اور محل کو اور بھی سفید بنا رہی تھی۔ جلاد طن گھر آگیا۔ نوبت نقارے اور شہنائیاں بجنے لگیں حبشی خدمت گار زرق برق وردیاں پہنے ہوئے ادھر ادھر دوڑتے پھرنے لگے۔

مگر پہاڑی رئیس زادہ تبسم کے ساتھ رکاب سے رکاب ملائے کہہ رہے ہیں

اڑتے ہوئے عربی گھوڑوں پر دیودار کے جنگلات سے پٹے ہوئے پہاڑوں کی طرف چلا جا رہا تھا۔ لعل ہائے ہلالی کی شرمانگیزیاں ریت میں سوئے ہوئے مرگ چڑوں کو جگا جگا کر اتار رہی تھیں، اور بلوریں قہقہے ریگستان میں حباب پیدا کر رہے تھے۔

ملک عکاس کی آؤ آور کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کی خورشید امنِ اختلاجِ قلب اور ہول کی وجہ سے بے ہوش پڑی تھی۔ مگر علاقہ کوہ قاف کے گل و گلزار شہر پارے اپنے آقا کو مٹکا ہوا لینز، نبید کی سربند اور کھلی بوتلیں اور لوبان کے پیڑھی دار ظروف دکھا رہے تھے۔ ان کے کچھ بھی بھاڑ میں نہیں تھا۔ ان کی چھنک مٹک اور اطوار کہہ رہے تھے کہ قبیحہ گئی تو کیا ہوا یمضی ما مضیٰ! ہم تو موجود ہیں۔ دیبا کی چادریں اور تکیے تک ابھی نہیں بدلے گئے۔ ہم بھی جوان ہیں، تم بھی جوان ہو۔ پھر کیا حرج ہے۔ گھر خالی ہے کوئی مواخذہ خواہ نہیں۔ ہم سے جوشِ سرور میں کوئی منتہائی نہ پاؤ گے۔ ہیں حذف نہ کیجیے۔ ہم بھی شہزادی کی طرح سب حربوں میں طاق ہیں۔ ہمارا طرزِ کلام ملاحظہ فرمایا، کتنا فتنہ خیز ہے۔ رجو طاقت آزمائی کے بعد ناطقی آگئی ہو، تو اس کے رفع کرنے کے لئے الحمد ہمارا آتش خطی موجود ہے۔

اگلے دن قصر و باغات کا نقشہ ہی بدل گیا۔ قبیحہ کی ماں تو مر گئی چچا بھی شکار سے نہیں لوٹا اور ملک عکاس کو فتنہ بغداد کی بیماری لگ گئی تھی، اب وہ آسیب زدہ ہو گیا تھا۔ اب وہ زور زور سے رو رہا تھا۔ اب وہ چیخ رہا تھا اور کپڑے پھاڑ رہا تھا۔ اب اسے کھانے کی سدھ تھی نہ پینے کی۔ اب وہ محل سے اٹھ اٹھ کر فصیل باغات کی طرف دوڑ رہا تھا کہ پھاٹک سے نکل کر ریگستانوں میں چلا جائے اور حبشی پہرے دار دیکھتے ہی دیکھتے رہ جائیں۔

... پریس لمیٹڈ، لاہور میں چھپا



☆ **مصنف خان فضل الرحمان**

بیسویں صدی کے آغاز میں بمقام رائپور ضلع سہارنپور (یو۔پی) پیدا ہوئے۔ جہاں ہیڈ تاجیے والا سے آ کر نہر جمن شرق گزرتی تھی، شمال میں سال کے سرجیون جنگلات سے پٹی ہوئی شوالک کی پہاڑیاں تھیں، پھر دون کا میدان اور اس کے بعد ہمالہ۔ نام حضرت شاہ عبد الرحیم رائپوری نے رکھا تھا اور انہیں کے اتارے ہوئے کپڑوں کو بہت عرصہ تک بعہد شیر خواری پہنتے رہے، مسلم ہائی سکول انبالہ، گورنمنٹ کالج لاہور اور لکھنؤ یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی۔

۱۹۴۸ء میں هجرت کر کے لاهور آئے اور اب یہیں وکالت کرتے ہیں، ۱۹۵۲ء میں حج کیا، صوم و صلواۃ کے پابند ہیں۔ مرغ بانی، حیوانات کی نسل کشی، اور شکار کا بہت شوق رہا ہے، بڑے پیمانے پر کاشت کرتے تھے، سیر کے شوقین ہیں اور بہت اچھے تیراک۔

ناموران اسلام میں ٹیپو سلطان، محمد علی جناح رح، علامہ اقبال رح سے خاص عقیدت ہے۔ **تصنیف:** آفت کا ٹکڑا (ناول) کئی ایک غیر مطبوعہ ناول و افسانے۔



☆ **ناشر:** بشیر احمد چودھری، ناشرین کے اس خانوادے کے فرد ہیں، جس نے جدید ادب کی نشر و اشاعت میں نولکشوری خلوص اور جذبے سے کام لے کر برصغیر پاک و ہند کے بیش تر نئے مصنفین کے ادب پاروں کو قارئین کے نظر نواز کیا۔

۱۹۳۵ء سے آج تک مختلف حیثیتوں سے نشر و اشاعت کی گراں قدر ذمہ داریوں کو نباہ رہے ہیں، اس دوران میں اپنے خاندان کے مختلف اداروں سے وابستہ